سہ ماہی
اُردو ادب
انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب

اڈیٹر
خلیق انجم

انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دلی

ترتیب

حرفِ آغاز

پروفیسر مسعود حسین خاں ایک جامع حیثیات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اُردو کے ممتاز نقاد، ادیب، محقق، متنی نقاد اور ماہر دکنیات ہیں۔ وہ ایک اعلا درجے کے شاعر بھی ہیں، لیکن ان کی علمی اور ادبی حیثیت ان کی شاعرانہ شخصیت پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ بعض لوگ تو اس حقیقت سے آگاہ بھی نہیں کہ مسعود صاحب ان تمام صفات کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے بعد پروفیسر مسعود حسین اُردو کے دوسرے ادیب ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اُردو ادیب کی حیثیت سے اُنھیں یہ اوّلیت حاصل ہے کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات میں نہ صرف باقاعدہ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ بلکہ انھیں اس شعبے کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

مسعود صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی اہم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور ان کی وائس چانسلری کے زمانے میں جامعہ نے غیر معمولی ترقی کی۔ لسانیات میں مسعود صاحب کی کتاب A phonetic and phonolgical study of the word غیر معمولی اہمیت کے حامل ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ مسعود صاحب نے میرزا بیدری کے پرت نامہ اور عبدل دہلوی کے ابراہیم نامہ کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ایک دکنی اُردو لغت بھی تیار کی ہے۔ مسعود صاحب مولوی عبدالحق کے بعد

شمالی ہند کے دوسرے محقق اور متنی نقاد ہیں، جنھوں نے دکنیات میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

مسعود صاحب کا انجمن ترقی اُردو (ہند) پر خاص حق ہے وہ اس طرح کہ وہ انجمن کے حیاتی رُکن ہیں اور پروفیسر آل احمد سرور کی عدم موجودگی میں دو بار انجمن کے سکریٹری اور "ہماری زبان" اور "اُردو ادب" کے اڈیٹر رہے ہیں۔ مسعود صاحب نے اُردو تحریک اور اُردو مسائل پر جو اداریے لکھے تھے، انھیں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ اداریے "اُردو کا المیہ" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مسعود حسین صاحب کی پچہتّرویں (۷۵) سال گرہ کے موقع پر انجمن نے ایک جلسۂ تہنیت منعقد کیا تھا، —— اس جلسے میں اُردو کے مقتدر ادیبوں اور نقادوں نے مسعود صاحب کی شخصیت اور اُن کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تقاریر اور مقالات کی شکل میں سیر حاصل گفتگو کی۔ یہاں وہی تمام مقالے مرتب کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔

خلیق انجم

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب

ایک کثیر جہاتی شخصیت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کیا کیا کچھ ہیں، اس کا بیان ایک دفتر کا متقاضی ہے۔ علم بٹورنا اور علم بانٹنا آپ کا مشغلہ رہا ہے۔

مسعود حسین خاں صاحب کا تعلق قایم گنج کی پٹھانوں کی مشہور بستی میں ایک معروف پٹھان خاندان سے ہے۔ وہ پیدا ہونے کے لیے پہلی بڑی جنگ کے خاتمے کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ انگریزوں نے قومی رہنماؤں کو جو جھانسہ دے رکھا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر آزادی عنایت ہوگی، اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

قائم گنج میں ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء میں وہ پیدا ہوئے لیکن سرکاری کاغذات میں غلطی سے یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء درج ہے۔ اس سے بڑا نقصان تو یہ ہوا ہی کہ قبل از وقت وظیفۂ حسنِ خدمت پر علیحدہ ہونا پڑا ہوگا۔

مسعود حسین صاحب دو ہی سال کے تھے کہ والد مظفر حسین صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے تین سال بعد جب کہ وہ صرف ۵ سال کے تھے، والدہ فاطمہ بیگم صاحبہ بھی رحلت فرما گئیں۔ وہ ڈھاکہ میں اپنے چچا کے پاس رہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر دہلی آگئے جہاں جامعہ ملیہ میں سلسلۂ تعلیم جاری رہا۔ اس کے بعد علی گڑھ۔

یہ تو تعلیم کے سلسلہ میں ایک رہ نوردِ شوق کی اندرونِ ملک سرگرمیاں تھیں۔ بات تو ہندستان کے باہر تک جاتی ہے۔ وہ لندن اور پیرس بھی گئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ امریکہ کا بھی سفر کیا لیکن

علم بانٹنے کی غرض سے ۔ چنانچہ دریائے علم کے دونوں، مشرقی اور مغربی کناروں سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔

مسعود حسین خاں صاحب کی علمی شخصیت بڑی کثیر جہاتی ہے، وہ ماہر لسانیات ہیں۔ پائے کے محقق ہیں یعنی کسی ادبی عمارت کو کھود کر اس کے پائے تک پہنچ جاتے ہیں۔ نقاد ہیں۔ اُردو تحریک کے فعال رہنما ہیں۔ اُردو کے المیے پر خوب لکھا ہے۔ شاعر ہیں۔ آپ بیتی نگار ہیں۔ خاکے بھی لکھے ہیں، پھر جامعات میں اُردو کے شعبوں اور جامعات کے معین امیر جامعہ کی حیثیت سے حُسنِ انتظام کے کرشمے بھی دکھائے ہیں کسی اور کا نام بتلا دیجئے جو اتنے میدانوں کا مرد ہو۔

پروفیسر آل احمد سرور، جنھوں نے قاضی عبدالغفار کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کی باگ ڈور ایک بڑے ہی پُرآشوب دور میں ہاتھ میں لی، جب امریکہ جا رہے تھے تو انھوں نے ڈاکٹر مسعود صاحب کو انجمن کے کارگذار معتمد، اور ہماری زبان، اور اردو ادب، کے اڈیٹر کے فرائض سونپے اور کہا ـــــ

"مجھے اطمینان ہے کہ اس عرصہ میں انجمن کے سارے کام ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہیں گے جن کی علمیت، ادبی ذوق، لسانیاتی معلومات، تعلیمی تجربے، متوازن شخصیت اور سنجیدہ مزاج کو خاص و عام سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔"

اور مسعود حسین خاں صاحب نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ بلکہ ان کی "خوبیوں" کی فہرست میں ایک اور بات کا اضافہ ہوا اور وہ اُردو سے ان کی محبت اور اُردو کے المیے پر ان کا اضطراب ہے۔ "ہماری زبان" کے ان کے اداریوں کا مجموعہ "اردو کا المیہ" ان کی کثیر جہاتی شخصیت کی اس جہت کو نمایاں کرتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کا آل انڈیا ریڈیو سے بھی تعلق رہا ہے اور یہاں بھی انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اُردو کی صدارت اور پروفیسری کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ یہاں پر انھوں نے دکنیات پر بہت پائے کا کام کیا ہے۔ دکنی مثنویوں کو ایڈٹ کیا اور دکنی کی لغت تیار کی جس میں بدیع حسین نے ان کی مدد کی، لسانیات پر مسعود حسین خاں صاحب کی دسترس

کی وجہ سے دکنی ادب کی تحقیق کو انھوں نے نیا موڑ دیا ہے۔

دکنی لغت کی ترتیب کے سلسلے میں انھوں نے کوئی ۱۴ ہزار الفاظ جمع کیے لیکن کوئی ۸٫۷ ہزار الفاظ پر مشتمل لغت شایع کی متعدد الفاظ انھوں نے اس لیے چھوڑ دیے کہ ان کی سند نہیں مل سکتی تھی یا وہ کسی اور وجہ سے شامل نہ کیے جا سکتے تھے۔ اس لغت کی حیثیت نشانِ راہ کی ہے منزل کی نہیں۔ اس شاہراہ کے نئے رہرو اس نشان تک پہنچ کر اس سے فیض پا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے وہ علی گڑھ گئے جہاں لسانیات کا شعبہ نیا نیا قایم ہوا تھا۔ اور یہ ان کا دل پسند موضوع ہے۔ پھر وہ وائس چانسلر بن کر جامعہ ملیہ آ گئے۔ جہاں انھوں نے بہت کام کیا ہے لیکن پھر بھی فضا راس نہ آئی اور وہ واپس علی گڑھ چلے گئے۔

انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کی بھی خدمت کی ہے۔

علی گڑھ سے وظیفے پر علیحدہ ہونے کے بعد پروفیسر ایمے ریٹس بنائے گئے جو وہ تاحیات رہیں گے۔

اور پھر جامعہ اُردو کے معین امیر جامعہ ہو گئے اور اس کی خدمت کی۔

اردو تنقید کو مسعود حسین خاں صاحب کی خاص دین ہے وہ جدید ہیئتی تنقید کے ماہر اور ادبی اسلوبیات کے بانی مانے جاتے ہیں۔

آپ بیتی لکھنا مشکل کام ہے۔ اور اس کا ادب میں ایک مقام ہے۔ آپ بیتی لکھنا ایک مشکل راہ پر قدم رکھنا ہے۔ توازن کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہیں شخصی پسند یا ناپسند واقعات پر کوئی رنگ چڑھا دے۔ لیکن "ورودِ مسعود" آپ کے سامنے ہے بعض تلخ باتیں آ گئی ہیں کیوں کہ مسعود صاحب انھیں چھپا نہیں سکتے تھے۔ ان کی بے باکی اور صاف گوئی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

مرقع نگاری میں بھی مسعود حسین خاں صاحب کا اپنا مقام ہے۔ اپنی نانی کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ ایک ہے۔ خالص واقعہ نگاری کو مزاح کی چاشنی دینا، اس مرقع سے سیکھیے۔ اور بھی لوگ ہیں، ڈاکٹر امیر خاں، شوق خاں، اور نور عالم خاں وغیرہ۔ ان کے مرقع بھی فکر انگیز ہیں۔

مسعود حسین خاں صاحب نے شاعری بھی کی ہے۔ لیکن کم گو ہیں اور شاید اس لیے خوش گو بھی۔ انھوں نے گیت لکھے لیکن اس صنف کی مزید خدمت نہ کی۔ اپنے کلام کے مجموعے "دو نیم" کے

تمہید شعر میں لکھتے ہیں۔

گیت میں گہرائی لانے کے لیے آریائی زبان کے ڈھائی ہزار سال کے جمالیاتی
عمل میں ڈوبنا پڑے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔"

مجموعے کا نام "دونیم" ہی ظاہر کرتا ہے کہ مسعود حسین خاں صاحب کی شاعری کا مرکز آج کا افسانہ ہے جس کی شخصیت زندگی کے تھپیڑوں سے "دونیم" ہوگئی ہے۔ اُن کو جو آزادی ملی وہ بھی ادھوری، اور پھر ملک "دونیم"۔ یہ سب کچھ کم کربناک کیفیت نہیں ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء یوم آزادی ہے۔ مجاہدین نے جو خواب دیکھے تھے، یہ تو ان کی تعبیر نہ تھی۔
بیبیاں چند اُداس

جن کی آنکھوں میں نہ نشہ نہ غرور
لذتِ شوق غلامی سے جواب تک تھیں چور
یوم آزادی نے بخشا نہ جنھیں جذب و سرور
لالہ و گل کا وہ پژمردہ ہجوم
دیکھ کر اور بھی دل تھا مغموم
خاکِ راہ آج بھی بیدار نہ ہونے پائی
ایسی آزادی کا آیا نہ سمجھ میں مفہوم

لیکن مسعود حسین خاں صاحب زندگی کے شاعر ہیں۔ صورتِ حال یاس انگیز ضرور ہے لیکن وہ مایوس نہیں۔

تو نے آسودگیٔ شوق سے کھایا ہے فریب
قلبِ شاعر میں جو دھڑکن ہے وہ مدھم تو نہیں

"آسودگیٔ شوق" کی ترکیب توجہ چاہتی ہے۔ مجاہدین آزادی کے خوابوں کو اس سے اچھے طریقہ پر نہیں بیان کیا جا سکتا تھا۔

دیارِ ہند سے جاتے ہوئے بتانِ فرنگ
وہ داغ دے گئے، جس کا نہ کوئی مرہم ہو

اور پھر —

مسعود! باغ ہند میں کیا آگئی بہار
ہم سے تو اِس بہار میں گایا نہ جائیگا

سنا ہے، ہند کی شاداب وادیوں میں رفیق
بہار آ بھی چکی ہے، بہار باقی ہے

مسعود حسین خاں صاحب پر ترک وطن کر کے پاکستان جانے کے لیے دباؤ پڑ رہا تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں۔

کنارِ گنگ و جمن آپ چھوڑ کر مسعود
کہیں نہ جائیں، نظر لاکھ اُن کی برہم ہو

مسعود صاحب منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ راہ میں رُکنا انھیں منظور نہیں۔ اور یہی ان کی جہدِ حیات کا مرکزی نکتہ ہے۔ کوئی ان کو روکے تو وہ برہم ہو جاتے ہیں۔

کیوں نہ میں تم کو کہوں ننگِ سفر
راہ میں جب قیام کی چھیڑو

یہ مسعود حسین خاں صاحب کی شخصیت کی محض جھلکیاں ہیں۔ آج ہم دیر سے سہی اپنا ایک اہم فرض پورا کر رہے ہیں۔ مسعود حسین خاں صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ ۷۶ ویں سال میں منا رہے ہیں۔ اپنی تہنیت ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو ان کی احسان مند ہے اور آئندہ بھی ان کے بہت سے احسانوں پر اپنا حق بھی جتانا چاہتے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

پروفیسر مسعود حسین خاں

بحیثیت وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر مسعود حسین خاں کی شخصیت بڑی وجیہہ، شاندار اور جاذب نظر ہے۔ ایسی کہ بڑے سے بڑے مجمع میں سب کی نظریں ان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ نیز ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ جہت ہے۔ وہ بہ یک وقت ایک مثالی ادیب، ایک مخلص اور دیانت دار محقق او رنقاد، ممتاز ماہر لسانیات، کامیاب اداریہ نگار اور اسلوب خاص کے شاعر ہیں۔

آج کے خصوصی جلسے کے لیے راقم الحروف نے ان کی خدماتِ جلیلہ میں سے جس پہلو کو منتخب کیا ہے، وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے ان کی دور رس خدمات اور ان کی امتیازی خصوصیات میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود دو وجہوں سے خاکسار نے اس کو ترجیح دی۔ ایک اس لیے کہ اس عہدہ یا ذمہ داری کو انھوں نے اپنے لیے ایک چنوتی سمجھ کر قبول کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کرنے کے، بہ زعم خود، کوئی اور شخص مجھ سے زیادہ بہتر اور موزوں مجھے نظر نہیں آیا۔ کیونکہ جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں میں یہ خاکسار واحد شخص ہے، جس کو زیر بحث دور میں بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس زمانے میں جامعہ میں جو گروپ قائم ہو گئے تھے، ان میں سے کسی سے میرا تعلق نہیں تھا۔ اس لیے مجھے غیر جانبدار ہونے کا فخر حاصل ہے۔

پروفیسر مسعود صاحب سے پہلے جامعہ کے اس منصب پر جو لوگ فائز تھے، وہ یا تو بانیانِ جامعہ سے

تعلق رکھتے تھے، جیسے مولانا محمد علی، عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین تاحیاتی رکن تھے، مثلاً پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر مسعود حسین خاں پہلے شیخ الجامعہ ہیں، جن کا دامن ان امتیازی خصوصیات سے خالی تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ جامعہ کی ابتدائی سطح پر ۱۰ اگست ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک چھ سال تک اس کے طالب علم رہ چکے تھے۔ نیز ذہنی طور پر جامعہ کی خصوصیات کے نہ صرف یہ کہ قدرداں تھے، بلکہ بجا طور پر وہ اس کے امین تھے اور جامعہ کی ترقی اور فروغ کا عزم بالجزم رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے پیش رو شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب سے ان کو شکایت تھی کہ وہ جامعہ کی ترقی اور وسعت کے لیے خاطر خواہ کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ جب وہ یو جی سی کی کمیٹی کے ممبر تھے تو اس کے چیرمین سے شکایت کی کہ آپ لوگ جامعہ جیسے قومی ادارے کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو ہر خدمت کے لیے تیار ہیں، لیکن ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ جب مسعود صاحب نے کسی موقع پر مجھ سے اس کا ذکر کیا تو میں بالکل خاموش رہا۔ مگر مجھے مجیب صاحب کا نقطۂ نظر معلوم تھا جو اپنی جگہ اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس سے ان کے خلوص کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ جامعہ کو جس قدر وسعت اور ترقی دی جائے گی، اس کی امتیازی خصوصیات اور بنیادی مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی اور مسلمان اساتذہ اور کارکنوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم سے کم تر ہوتی چلی جائے گی۔ بعد کے حالات نے اس خیال کی حرف بہ حرف تصدیق کر دی۔ دوسری طرف جامعہ ملیہ سے مسعود صاحب کی غیر معمولی دلچسپی اور غایت درجہ محبت بھی واضح تھی، اسی لیے اس مسئلے پر ان سے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پروفیسر مجیب کے خلاف نہیں تھے، صرف جامعہ کے مفاد میں وہ چاہتے تھے کہ وہ اسے ایک مکمل یونیورسٹی کا درجہ دینے کی کوشش کریں۔ حکومت ہند اور یو جی سی میں ان کی عزت کرنے والوں کی کمی نہیں، صرف ان کے اشارے کی ضرورت تھی۔

بالآخر کچھ عرصے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور مجیب صاحب کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ جامعہ کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکتے۔ اس لیے مجلس منتظمہ نے ان کی جگہ پر ایک سینیر اور ممتاز استاد اور جامعہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کو ان کا قائم مقام مقرر کر دیا اور اخبارات میں شیخ الجامعہ کے عہدے کا اشتہار دیدیا گیا۔ اس وقت جامعہ میں دو گروپ تھے۔ ایک کا تعلق ٹریننگ کالج سے تھا، جس میں بیشتر لوگ ترقی پسند تھے۔ دوسرے کا جامعہ کالج کے اساتذہ

پر مشتمل تھا جو مختلف خیالات کا مرکب تھا لیکن اپنے آپ کو جامعہ کی شاندار روایات اور اس کے بنیادی مقاصد کا علمبردار کہتا تھا۔ اُس وقت شیخ الجامعہ کے امیدوار کی حیثیت سے جامعہ کی فضا میں دو ناموں کا چرچا تھا۔ ایک ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کا دوسرا پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کا۔ ٹریننگ کالج کے اساتذہ علی الاعلان اوّل الذکر کے لیے کام کر رہے تھے۔ صرف یہی نہیں، ان کا ایک وفد اُس وقت کے امیر جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب سے ملا جن کو جامعہ کے دستور کے مطابق پینل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار حاصل تھا اپنے امیدوار کے حق میں ان کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ واپس آکر اس نے اعلان کیا کہ امیر جامعہ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر پینل میں ان کا نام ہوا تو وہ ان ہی کو منتخب کریں گے۔ مسعود حسین صاحب کی زیر سطح کچھ کوشش ہو رہی ہو تو مجھے خبر نہیں۔ البتہ جامعہ کالج کے اساتذہ کے بارے میں میری ذاتی رائے تھی کہ وہ خاموش تماشائی تھے۔ خود میری ذاتی رائے تھی کہ مسعود صاحب اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے، کیونکہ اس سے نہ تو ان کو کوئی مالی فائدہ تھا اور نہ ہی اس سے ان کی شہرت اور عزت میں کوئی قابل قدر اضافہ ہوتا۔ خدا خدا کر کے پینل تیار ہو گیا، جس میں پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب دونوں کے نام شامل تھے۔ اب امیر جامعہ کے فیصلے کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ بالآخر کچھ عرصے کے بعد پروفیسر مجیب صاحب کے نام بذریعہ رجسٹری امیر جامعہ کا خط آیا، جسے حسب معمول میں نے وصول کیا اور مجیب صاحب کی اجازت کے مطابق اسے کھول کر پڑھا۔ میری توقع کے خلاف اس میں مسعود صاحب کا انتخاب کیا گیا تھا۔ رازداری کا تقاضا تھا کہ مجیب صاحب کی خدمت میں اس وقت پیش کروں، جب وہ بالکل تنہا ہوں۔ اس انتظار میں ایک دو روز لگ گئے۔ اس درمیان ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک روز حسب معمول جب ضروری کاغذات قائم مقام شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں پیش کئے تو انھوں نے فرمایا کہ نہ جانے کیوں اب تک امیر جامعہ کا خط نہیں آیا۔ میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملایا۔ حالانکہ امیر جامعہ کا خط میری جیب میں موجود تھا۔ آخر کار ایک روز مجیب صاحب بالکل تنہا مل گئے اور ان کی خدمت میں امیر جامعہ کا خط پیش کر دیا۔ مجیب صاحب کے چہرے سے ان کے مافی الضمیر کا اندازہ مشکل ہوتا ہے۔ مگر میرا وہم تھا یا حقیقت، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ان کو بھی امیر جامعہ کے

فیصلے پر حیرت ہوئی۔ انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ اس فیصلے کی کسی کو خبر نہ ہو، آپ پہلی فرصت میں علی گڑھ جایئے اور مسعود صاحب کی منظوری لائیے۔ حسب ہدایت پہلی ٹرین سے علی گڑھ گیا اور مسعود صاحب کی خدمت میں امیر جامعہ کا خط پیش کرتے ہوئے ان کی تحریری منظوری کے لیے عرض کیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اس طرح پیش آئے، گویا ان کو پہلے سے سب کچھ معلوم تھا جب انھوں نے اپنی منظوری دے دی تو میں نے عرض کیا کہ آپ کب اور کس ٹرین سے آرہے ہیں، تاکہ میں شیخ الجامعہ کی کار لے کر اسٹیشن پر موجود رہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تک میں چارج نہ لے لوں۔ مجھے اس کار کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ ان کے اس جواب پر مجھے اس لیے حیرت ہوئی کہ بالعموم کار کے غلط استعمال کی وجہ سے مجھے کافی پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ مختصر یہ کہ ایک دو روز کے بعد مسعود صاحب جامعہ تشریف لائے اور باقاعدہ چارج لیا۔ غالباً جامعہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی شیخ الجامعہ نے باقاعدہ چارج لیا ہو چنانچہ ان کے اس نئے کٹھن اور ہنگامہ خیز عہد کا ۲ نومبر ۱۹۷۳ء کو آغاز ہوا۔

مسعود صاحب بڑی تمناؤں، آرزوؤں اور بلند و مستحکم ارادے کے ساتھ اپنی مادر علمی اور اپنے بزرگ چچا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی زندہ اور چہیتی یادگار کی خدمت کے لیے جامعہ تشریف لائے تھے۔ مگر بدقسمتی سے جامعہ کے ایک چھوٹے سے گروپ نے صرف اس لیے کہ اس کے اُمیدوار اس عہدے کے لیے منتخب نہیں ہو سکے تھے، جامعہ کی تمام روشن اور مثالی روایات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جامعہ کا ایک بڑا اور با اثر گروپ جو کالج کے اساتذہ پر مشتمل تھا، وہ اب تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا مگر وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو گیا اور محض ایک شخصی اختلاف کی بنا پر وہ بھی اس ان ہولی الائنس Unholy Alliance میں شریک ہو گیا۔ اب مسعود صاحب کی پشت پر جامعہ کے صرف وہ بزرگ تھے جو ان کے ہمدرد اور قدرداں تھے مثلاً امیر جامعہ جسٹس ہدایت اللہ۔ اعزازی خازن مدحت کامل قدوائی، علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر اور جامعہ کی گورننگ کونسل کے ممتاز رکن کرنل بشیر حسین زیدی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے قابل اعتماد دوست اور ساتھی اور ممتاز ماہر تعلیم و دانش ور خواجہ غلام السیدین۔ جامعہ کے ممتاز اور بزرگ حیاتی رکن ڈاکٹر سید عابد حسین اور انجمن (کورٹ) اور مجلس منتظمہ کے اراکین کی بھاری اکثریت کا غیر مشروط تعاون انھیں حاصل تھا۔ ان ہی بزرگوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی خواہش اور کوشش سے مسعود صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔ اس لیے توقع تھی کہ

کہ وہ کامیابی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض ادا کر سکیں گے اور ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی، مگر فلک کو یہ بات منظور نہیں تھی۔

اُس وقت جامعہ کی قانونی پوزیشن یہ تھی کہ اسے مکمل یونیورسٹی کا اعزاز حاصل نہیں تھا۔ اسے صرف یونیورسٹی کا درجہ دیدیا گیا تھا، جسے انگریزی میں ڈیمڈ ٹوبی یونیورسٹی Deemed to be University کہا جاتا تھا۔ تعلیمی کیفیت یا معیار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بہ مشکل صرف ایک پوسٹ گریجویٹ کلاس شروع کی جا سکی تھی، وہ بھی تاریخ کی جو پروفیسر مجیب صاحب کا خصوصی مضمون تھا۔ حالانکہ سب سے پہلے اُردو میں ایم اے کی کلاس شروع ہونی چاہیے تھی، کیونکہ جامعہ کا اُردو زبان و ادب سے خاص اور گہرا تعلق تھا اور اُس وقت ملک میں جامعہ ملیہ واحد یونیورسٹی تھی، جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر مسعود صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے شعبۂ اُردو کی طرف توجہ دیں گے اور اسے نہ صرف جامعہ کے شایانِ شان بنائیں گے، بلکہ دوسری یونیورسٹی کے لیے مثالی اور قابلِ تقلید ہو۔ چنانچہ اب انھیں ایک شخص کی تلاش ہوئی جو ان کے معیار اور منصوبے کے مطابق شعبۂ اُردو کو بنا سکے۔ شیخ الجامعہ منتخب ہونے کے بعد جب ۲۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو شعبۂ اُردو میں ان کے خیر مقدم کے لیے جلسہ منعقد ہوا تو اس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اس پر زور دیا کہ اُردو زبان کی ترقی اور اس کے لیے کام کرنے کے جو مواقع اور امکانات جامعہ میں ہیں۔ جہاں ہر سطح پر اُردو تعلیمی اور تدریسی زبان ہے، وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ جامعہ اس کے لیے قدم اُٹھائے کہ وہ اُردو زبان کی تعلیم اور ترقی کے لیے ایک بہت بڑا مرکز بن جائے۔ اس کے لیے اسے نصابِ تعلیم اس طور پر ترتیب دینا چاہیے کہ وہ نئی ضرورتوں کو پورا کرے اور طلبہ کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا ہو۔ انھوں نے اُردو ترجمہ نگاری اور صحافت میں ڈپلوما کورسز جاری کرنے کی طرف بھی اس سلسلے میں اشارہ کیا۔ جب جامعہ کی طرف سے اُردو کے پروفیسر کا اشتہار شائع ہوا اور اس کے لیے جو درخواستیں موصول ہوئیں اور جو امیدوار سلکشن کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے ان میں صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایسے باصلاحیت نظر آئے جو جامعہ کی ضرورت کو بہ احسن پورا کر سکتے تھے اس لیے سلکشن کمیٹی نے بالاتفاق انھیں منتخب کر لیا اور انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا۔ ابھی

بہت زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ کالج کے کچھ اساتذہ کو ان کی ذات اور ان کے کام سے اختلاف پیدا ہوگیا اور رفتہ رفتہ اس اختلاف نے تحریک کی صورت اختیار کرلی اور جامعہ میں ایک ہنگامہ خیز صورت پیدا ہوگئی۔ یہ تحریک اور صورت حال صحیح تھی یا غلط، یہ میرے مقالے کا موضوع نہیں۔ مجھے صرف یہ دیکھنا اور دکھلانا ہے کہ اس ہنگامہ خیز اور اشتعال انگیز موقع پر خود مسعود صاحب کی کیا کیفیت تھی؟ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے پورے صبر وضبط سے کام لیا اور اپنے اصول اور انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ تحریک کے علمبرداروں کا مطالبہ تھا کہ نارنگ صاحب کو فوراً معطل کردیا جائے۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہیں ایک یہ کہ میں ایک معمولی ٹیچر کا اس قدر احترام کرتا ہوں کہ بغیر کسی ثبوت کے معطل نہیں کرسکتا، یہاں تو ایک پروفیسر کا معاملہ زیر بحث ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ میں نے ماہرین قانون سے مشورہ کرلیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر الزام ثابت بھی ہوجائے تو زیادہ سے زیادہ وارننگ دی جاسکتی ہے یا ایک ترقی روکی جاسکتی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں بہت جلد مجلس منتظمہ کا جلسہ بلا رہا ہوں، جس میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے گی۔ اس کے سامنے جملہ باتیں رکھ دی جائیں گی۔ وہ جو فیصلہ کرے گی، مجھے منظور ہوگا۔ چنانچہ حسب وعدہ بہت جلد مجلس منتظمہ کا جلسہ بلایا گیا اور اس کے ایک معزز رکن کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز پیش کی۔ مگر تحریک کے علمبرداروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک پروفیسر موصوف کو معطل نہیں کیا جائے گا، وہ تحقیقاتی کمیٹی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ان کے اس بے لچک طرز عمل سے مجلس منتظمہ کا یہ جلسہ بغیر کسی فیصلے کے برخاست کردیا گیا اور حسب معمول تحریک جاری رہی۔ اس صورتِ حال سے مایوس ہوکر بالآخر مسعود صاحب نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ جن بزرگوں کی کوششوں سے اس عہدے کو انھوں نے قبول کیا تھا، انھوں نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے بجا طور پر فرمایا کہ ان ناخوشگوار حالات میں کوئی کام کرنا ممکن نہیں، پھر محض باقی ماندہ مدّت کو پورا کرنے کے لیے رُکنا محض تضیع اوقات ہے۔ اس لیے ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو استعفا دے کر علی گڑھ واپس چلے گئے اور اپنے سابق عہدے کا چارج لے لیا۔

اب اپنے اس مقالے کو مسعود صاحب کے ایک اہم اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ وہ اپنی

خودنوشت سوانح حیات: ورودِ مسعود میں لکھتے ہیں:

"جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا کھویا کیا پایا، تو ذاتی طور پر کھونے کا پلا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔ تعلیمی مصروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔ اس لیے علی گڑھ کے طویل قیام میں ابتدا میں وارڈن رہنے کے بعد میں نے کبھی دوسرا عہدہ قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے مجھے سرسید ہال کے پرووسٹ کے عہدے کی پیش کش کی تھی۔ میں نے اس سے بھی معذرت کر لی تھی۔ لیکن جب عابد صاحب اور دیگر بزرگوں نے مجھے جامعہ چلے آنے کو کہا تو اسے میں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اس کی وجہ کرسی کی ہوس نہیں بلکہ اس ادارے سے وہ محبت تھی جو اسکول کے دنوں سے میرے دل میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس جذبے کا اظہار جامعہ پہنچ کر اپنی تقریر میں اس طرح کیا تھا کہ:

"لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں، میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے۔" اسی اسپرٹ کے ساتھ میں جامعہ پہنچا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وائس چانسلری کی ذمہ داریوں سے مجھے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ حالانکہ پروفیسر محمد مجیب کا مشورہ بھی یہی تھا کہ میں اپنا علمی کام جاری رکھوں۔ انتظامی معاملات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جامعہ پہنچکر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اس لیے علمی لحاظ سے بنجر رہے کہ سوائے چند خطبات اور مضامین کے اور کچھ نہ لکھ سکا......"

(صفحات ۲۴۲-۲۴۳)

ڈاکٹر اسلم پرویز

کارواں اور غبارِ پسِ کارواں

(پروفیسر مسعود حسین خاں کی نذر)

کتاب نما کے تازہ شمارے میں خامہ بگوش کی ایک اور دلچسپ تحریر نظر سے گزری۔ اپنی اس تحریر میں خامہ بگوش نے کشور ناہید کی خودنوشت 'بری عورت کی کتھا' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ آپ بیتی کے بارے میں لکھا ہے:

"گزری ہوئی زندگی کو لفظوں میں مقید کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ انسان جس بنیاد پر یہ کام کرتا ہے وہ بہت کمزور ہے حافظہ انسان کا ساتھ کبھی دیتا ہے اور کبھی نہیں اور بعض اوقات تو صریحاً دھوکا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمزور بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائے گی اس کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب زمین بوس ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر آپ بیتیاں منہدم عمارتوں کے ملبے جیسی نظر آتی ہیں اور ان سے اندازہ نہیں ہوتا کہ اصل عمارت کیسی تھی۔"

(کتاب نما نومبر ۱۹۹۵ء ص ۴۳)

بیتیوں، اور آپ بیتیوں کے بارے میں خامہ بگوش کی رائے اس لیے بھی وقیع سمجھی جانی چاہیے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کی تالیفات کا مطالعہ ان کا ایک محبوب مشغلہ ہے جس کا ثبوت ہے ان کے ذاتی کتب خانے میں سوانح عمریوں اور خودنوشتوں کا بیش بہا ذخیرہ۔ مندرجہ بالا اقتباس کا یہ تیکھا جملہ کہ 'اکثر آپ بیتیاں منہدم عمارتوں کے ملبے جیسی نظر آتی ہیں خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ یہاں لفظ 'اکثر' کا استعمال نہ صرف یہ بتاتا ہے کہ خامہ بگوش کا قلم سنبھل سنبھل کر چلتا ہے بلکہ اس سے ان کے

نظرے میں مستثنیات کی گنجائش بھی پیدا ہوتی ہے۔

'بری عورت کی کتھا' جیسے عنوان میں وہی ریاکارانہ انکسار ہے جس کا اظہار مہذب لوگ اپنے بارے میں لفظِ خاکسار کے استعمال سے کرتے ہیں۔ اس کے برعکس پروفیسر مسعود حسین خاں کی خود نوشت سوانح حیات کے عنوان 'ورودِ مسعود' کے دونوں لفظ یعنی ورود اور مسعود اپنے Connotation کے اعتبار سے ایک طرح کی تکریم اور برتری کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے اگرچہ ورود اور وارد ہونا ہم معنی ہیں لیکن فصیح اردو میں ورود زیادہ تر مسعود ہی ہوتا ہے جب کہ وارد ہونا اکثر حالتوں میں نامسعود یا کم از کم ناگوار ضرور قرار پاتا ہے۔ اس عنوان میں کسی قسم کے ریاکارانہ انکسار کے برعکس وہ بے باکانہ اظہار ہے جس میں آنم کہ من دانم کی گونج سنائی دیتی ہے 'ورودِ مسعود' کے عنوان میں تعلّی کی وہی شان ہے جو غالبؔ اور مومنؔ جیسے شاعروں کے بعض مقطعوں میں نظر آتی ہے۔

یہاں 'ورودِ مسعود' پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ مسعود صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے جب میں 'ورودِ مسعود' پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کے بعض اندراجات سے لگتا ہے کہ میں اور میرے دوست خلیق انجم ایک عرصے سے مسعود صاحب کا پیچھا کرتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان کے ساتھ ہم دونوں کا تعلق کارواں اور غبارِ پسِ کارواں جیسا ہے۔ یہاں غبارِ پس کارواں کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی طرح کے مصنوعی عجز و انکسار سے کام لے رہا ہوں۔ غبارِ پس کارواں کی وقعت کا اندازہ اس فارسی شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

چوں در بطحا سوارِ ناقہ ناگاہ می بینم
من از چشمِ تمنائی غبارِ راہ می بینم

۱۹۴۹ء میں اینگلو عربک کالج سے بی۔ اے پاس کرکے مسعود صاحب ایم۔ اے میں داخلہ لینے علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹۵۰ء اینگلو عربک اسکول سے دسویں جماعت پاس کرکے میں اور خلیق انجم انٹر میڈیٹ فرسٹ ایر میں داخلے کے لیے علی گڑھ آئے۔ مسعود صاحب نے اسٹریچی ہال میں لگنے والے داخلے کے بازار کا جو ذکر کیا ہے ویسا ہی بازار ۱۹۵۰ء میں اسٹریچی ہال میں ہمیں لگا ہوا ملا۔ داخلے کی کارگزاری میں جس طرح مسعود صاحب کی رہ نمائی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کی تھی بالکل اسی

طرح ہم دونوں کو بھی فرشتۂ رحمت کی طرح وہیں اسٹریچی ہال میں ایک سنیئر مل گئے ان کا نام تھا فضل حق تمنا ۔ یہ صاحب انتہائی مہربان ثابت ہوئے چناں چہ بارہ بجے تک ہم داخلے، ڈائننگ ہال اور ہاسٹل کے کاغذات حاصل کرکے ممتاز ہاسٹل پہنچے جو اس آفتاب ہال کا ایک ہاسٹل ہے جس کے آفتاب ہاسٹل میں ہم سے پہلے مسعود صاحب رہ چکے تھے ۔

۵۴-۱۹۵۳ء کا تعلیمی سال علی گڑھ میں ہمارا بی ۔اے کا آخری سال تھا۔ ہمارے اردو نصاب میں اقبال کی بالِ جبریل داخل تھی ۔ مسعود صاحب اسی سال ولایت سے لوٹ کر آئے تھے اور شعبۂ اُردو میں ریڈر کے عہدے پر فائز تھے انھوں نے ہمیں بالِ جبریل پڑھانی شروع کی ۔ پہلے دن جب وہ کلاس میں آئے تو ہمارا سامنا مسعود صاحب کی انتہائی دل کش شخصیت سے ہوا۔ گورا چٹا رنگ، قد اتنا دراز جیسے ابھی ابھی سروِ چمن سے خطِ بندگی لکھوا کر آرہے ہوں، مغربی لباس زیب تن ۔ سر پر اس وقت بھی اتنے ہی بال تھے جتنے آج ہیں چشمہ آنکھوں پر اس وقت بھی تھا۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے ہونٹ اس وقت بھی ایسے ہی متبسّم انداز میں کھلتے تھے جیسے آج ۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز تب بھی ویسا ہی تھا ۔ چہرہ مہرہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا جیسا آج ہے بس اب ذرا درازیٔ عمر کے سبب خفیف سی مرجھاہٹ نظر آتی ہے اتنی ہی جتنی صبح کے خریدے ساگ سبزی پر شام تک آجاتی ہے ۔ آواز میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح خُدا بری نظر سے بچائے، سامنے کے نظر آسکنے والے دانت سلامت ہیں ویسی ہی دائیں بائیں اوپر نیچے کی خفیہ ڈاڑھیں بھی ہوں گی ۔ دراصل بعض لوگوں کی کاٹھی ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ عمر کے ہر دور میں ماشاء اللہ لاٹھی کے لاٹھی ہی رہتے ہیں اور، نجیب الطرفین، پٹھان تو خاص طور پر۔ مسعود صاحب شاید ذہنی طور پر Grow کرنے میں اتنے منہمک رہے ہیں کہ جسمانی عمر رسیدگی کی انھیں زیادہ فرصت ہی نہیں ملی ۔ ہاں تو ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مسعود صاحب نے ہمیں بی ۔اے میں بالِ جبریل پڑھانی شروع کی ۔ سرسید ہال میں شعبے کی قدیم عمارت کے پیچھے ظہور وارڈ اور یونین آفس کے درمیان جو گھاس کا میدان ہے مسعود صاحب جاڑوں کی سہانی دھوپ میں وہیں کلاس لیتے تھے ۔ وہ اپنی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھاتے تھے ۔ کرسی کی پشت روسٹرم کا کام انجام دیتی تھی ۔ مسعود صاحب نے سب سے پہلے اقبال کی نظم مکالمہ ابلیس و جبریل پڑھائی ۔ اس نظم میں ابلیس اور جبریل کے کرداروں کے مطابق

اقبال نے دونوں کے لب ولہجے میں جو امتیاز پیدا کیا ہے اس کی جانب مسعود صاحب نے نظم کی قرأت کے ذریعے ہماری توجہ مبذول کرائی۔ مثلاً پہلا ہی شعر:

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو
سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

مسعود صاحب نے اس طرح پڑھا کہ پہلے مصرعے سے اضطراب ناآشنا جبریل کا استعجاب اور دوسرے سے دنیاوی کلفتوں کا نظارہ کرنے والے ابلیس کا وجدان دونوں صاف جھلکتے تھے۔ مسعود صاحب کے اندازِ تدریس کا پہلا ہی نقش اتنا بھرپور تھا کہ آج چالیس سال گزرنے کے بعد حافظے پر اس نقشِ اوّل کے سوا بقیہ تمام نقوش دھندلا سے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم مسعود صاحب سے یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کے شاگرد رہے ہیں تو وہ ہماری بات مان تو لیتے ہیں لیکن انھیں یہ یاد نہیں آتا کہ ہم کب ان کے شاگرد رہے اور یہ صورت حال ان کے بہت سے شاگردوں کے درمیان رہی ہے۔

مسعود صاحب کا شمار ان گنے چنے اُردو دانوں میں ہے جنھوں نے لسانیات کی جانب پہل کی اور اسے اپنی علمی کاوشوں کا مرکز بنایا۔ اس طرح جب اُردو میں لسانیات میں دلچسپی لینے کا رواج عام ہوا تو مسعود صاحب کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے بھی اس سمت میں بڑھنا شروع کیا۔ خلیق انجم دہلی یونیورسٹی کے اُردو والوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے لسانیات میں کامیابی کے ساتھ ڈپلوما کورس پورا کیا۔ کامیابی کے ساتھ اس لیے کہ اس سے پہلے کئی اُردو والے اسی ڈپلوما کورس میں داخلہ لے کر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ پھر اس کے چار سال بعد دہلی یونیورسٹی کے اُردو والوں میں وہ پہلا شخص تھا، جس نے لسانیات میں ایم۔لٹ پاس کیا۔ مسعود صاحب اپنی علمی زندگی کے بہت سے معرکے سر کرتے ہوئے آج ایک اعلا منصب پر ہیں جہاں تک غبارِ پسِ کارواں کا تعلق ہے اس غبار کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک عین کارواں سے لپٹا ہوا غبار جو بگولے کی شکل اختیار کرتا ہوا بھنورایا ہوا سا کارواں ہی کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے اور دوسرا اس بگولے کے پیچھے کا وہ غبار جو زمین سے اٹھ اٹھ کر بیٹھتا رہتا ہے اور ہانپتا کانپتا سا بگولے کی قیادت میں کارواں کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ غبارِ پس کارواں کی ان دونوں سطحوں کو آپ بالترتیب خلیق انجم اور اسلم پرویز کا نام دے سکتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے و نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی،
کی جب ادبی حلقوں میں دھوم مچی تو مولوی وحید الدین سلیم نے بڑی حسرت سے ایک، تمات میں
مرزا فرحت اللہ بیگ سے یہ کہا کہ ہمیں کوئی ایسا شاگرد نہ ملا جو ہم پر ایسا خاکہ لکھتا، یہ تو تھی شاگردی
کا حق ادا کرنے کی بات لیکن مسعود صاحب توان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے استادی کا حق ادا کردیا
'ورودِ مسعود، میں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے بارے میں انھوں نے محبت، شفقت اور خیر خواہی کے
جن جذبات کا اظہار کیا ہے اسے پڑھ کر رشک آتا ہے اور طبیعت یہ سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ
ہمیں اپنے پورے دور ملازمت میں ایسا کوئی مشفق اور سرپرست نہ ملا جو ہمارے لیے خیر خواہی
کے اسی جذبے کے ساتھ کبھی کچھ سوچتا یا کرتا۔

'ورودِ مسعود، کے پہلے باب میں مسعود صاحب نے اپنے خاندان، اپنی ولادت اور بچپن
کا ذکر کیا ہے۔ وہ پٹھان ہیں اور ان کا تعلق سرحد کے آزاد قبائلی علاقے سے ہے۔ خلیق انجم خود کو روہیلا
بتاتے ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ہم سرحدی یوسف زئی پٹھان ہیں اور ہمارے
اجداد سوات سے یہاں آئے تھے۔ اس پر لگے ہاتھوں ایک لطیفہ سنتے چلیے۔ جب ہم پہلے پہل علی گڑھ
پہنچے تو ہماری انٹروڈکشن نائٹ میں ہم سے یہ سوال کیا گیا کہ ہماری ذات کیا ہے۔ ہم نے کہا پٹھان
اس پر کسی اور سنیئر نے پوچھا کہ آپ کہاں کے پٹھان ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ کابل کے۔ ایک اور سینئر
نے فوراً فقرہ جڑا کہ اتنا تو کابلی چنا ہوتا ہے جتنے بڑے آپ ہیں۔ یقیناً مسعود صاحب کو اپنے
انٹروڈکشن میں ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا ہوگا۔ یہ ایک ہی مادّے سے مشتق دو مختلف المعانی الفاظ
والی صورت ہے۔

ان بکھری ہوئی باتوں کو سمیٹتے ہوئے ایک بات اور یاد آئی، خاصی دلچسپ ہے۔ ہم اُردو میں ایک
محاورہ استعمال کرتے ہیں دودھ کا دھلا ہوا۔ اگرچہ دودھ کا دھلا ہوا سے مراد صاف ستھرا اور بے عیب
ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ محاورہ ہمیشہ طنز یہ طور پر الٹے ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور
عیب دار یا دائی کا مطلب ادا کرتا ہے مثلاً 'جی ہاں، آپ تو جیسے دودھ کے دھلے ہوئے ہیں'؛
ایسی صورت میں مسعود صاحب جیسی ٹرانسپیرنٹ شخصیت کو دودھ کا دھلا ہوا کہنے کی نادانی یا گستاخی میں
کیسے کرسکتا ہوں ہاں ان کی شیر خواری کے زمانے کی رعایت اور دودھ اور دھلے کے تعلق سے انھیں

دھوبن کا دودھیایا ہوا ضرور کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر آپ کو یاد دلاتا چلوں:

طفل میں خو بو ہو کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

مسعود صاحب کے زمانے میں اگرچہ ڈبے کا دودھ اور سرکار کی تعلیم دونوں عام ہو چکے تھے لیکن مسعود صاحب ڈبے کے دودھ کی وبا سے اس امر کے باوجود محفوظ رہے کہ ان کی والدہ کے پاس ان کی اشتہا کے لائق دودھ نہ تھا جس کی بنا پر انھیں اپنے گھر کی دھوبن کا دودھ پینا پڑا۔ اسی نسبت سے میں نے یہ کہا کہ انھیں دھوبن کا دودھیایا ہوا کہا جاسکتا ہے۔ دھوبن کا دودھ پینے کا فائدہ یہ ہوا کہ مسعود صاحب ڈبے کے دودھ کی لعنت سے محفوظ رہے اور ان میں ماں باپ کے اطوار کی پٹھانی خو بو باقی رہی۔ چنانچہ شاید دھوبن کے دودھیائے ہونے ہی کا اثر ہے کہ انھوں نے 'ورود مسعود' میں کئی لوگوں کو خوب دھوبی پاٹ دکھایا ہے۔

مجھے مسعود صاحب سے قربتیں حاصل نہیں رہیں۔ لیکن وہ میرے لیے اجنبی کبھی نہیں رہے اور اب تو میں بھی ان کے لیے کچھ زیادہ بیگانہ نہیں اور شاید آج کے بعد تو بالکل نہیں تخلیق انجم کا کہنا ہے کہ مسعود صاحب نجی ملاقاتوں میں خوب کھل کر بات کرتے ہیں۔ گویا وہ خرد و بزرگ کی غیر رسمی محفل میں اپنے مقام اور منصب کا تاج دربار کے تھکے ہوئے بادشاہ کی طرح سر سے اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں اور پھر بے تکلف گفت گو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، قائم گنج کے پٹھان جب کھلی گفتگو کرتے ہیں تو اس میں کیا چٹخارہ ہوتا ہے اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے اس لیے ہے کہ علی گڑھ اور جامعہ کے بہت سے قائم گنجی پٹھانوں کے ساتھ میں تھوڑا بہت اُٹھا بیٹھا ہوں۔

کارواں اور پس کارواں کی رعایت سے اس بات چیت کے آخر میں مجھے ایک بات یہ کہنی ہے کہ میں اتنا مہذب نہیں کہ اپنے بارے میں یہ کہوں کہ میں تو مسعود صاحب کے پیروں کی دھول بھی نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر میرے اور مسعود صاحب کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ ایک سچّا عالم اور اچھا استاد شہسوار کی طرح اپنے اثرات کا غبار اڑاتا ہوا چلتا ہے لیکن غبار بننے کی توفیق کسی مٹی کو نہیں ہوتی۔ پیاسے ذرات ہی غبار بن بن کر اڑتے ہیں جو اپنے ساتھ ساتھ اس کارواں کا بھی پتا دیتے ہیں جو ان سے آگے آگے ہے۔

•••

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

انتخاب کلامِ غالب

مرتبہ۔ پروفیسر مسعود حسین خاں

اُردو ادب کی تاریخ میں مسعود حسین صاحب کو کئی اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔ وہ ماہرِ لسانیات بھی ہیں اور دیدہ ور نقاد بھی۔ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور نثار بھی۔ ان کا مزاج "جہاں بانی" سے زیادہ "جہاں بینی" کا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شعر کہنے سے زیادہ ان کے فن کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب شعر فہمی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر اپنے اس تعصب کا بھی اظہار کر دوں کہ لسانیات کا ماہر ریاضی کا ماہر تو ہو سکتا ہے مگر مذاقِ شعری کے معاملہ میں ہمیشہ مشتبہ رہتا ہے مگر مسعود صاحب کی شخصیت اس کلیہ سے ہمیشہ مستثنٰی رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ان کی تحریروں میں بے کیفی یا خشکی نہیں ملے گی۔ تاریخ زبان اُردو کا موضوع خشک ہے مگر ان کے برجستہ جملوں اور فقروں نے اس کو شگفتہ بنا دیا ہے۔ اس وقت چونکہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے اس لیے اس سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔

اس تمہید کا مقصد دراصل ان کی تالیف 'انتخاب کلام غالب' پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔ اگرچہ غالب کے بہت سے انتخابات اب تک شائع ہو چکے ہیں مگر بقول شخصے یہ غالب کے ایک دیدہ ور کا انتخاب ہے۔ کسی کلام کے انتخاب کے چند طریقے ممکن ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو خود مسعود صاحب نے اختیار کیا یعنی اپنے ذوقِ سخن کو رہنما بنا کر پسندیدہ کلام کو یک جا کر دیا۔ اس طریق عمل میں انتخاب کرنے والے کا تحفظ تو ہے مگر عزت سادات کے خطرہ میں

پڑجانے کا ڈر رہتا ہے[1]۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موضوعات کے عنوان قائم کر کے انتخاب کیا جائے۔ اس طرح تاریخی ترتیب میں شاعر کے عہد بعہد نظریات کی تفہیم ممکن ہے۔ اس کے علاوہ بعض مرتبین کے یہاں اچھے برے اشعار کا مسئلہ اتنا نہیں ہوتا جس قدر ان کے نزدیک یہ بات اہم ہے کہ شاعر کے ذہنی ارتقا کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

مسعود صاحب کے اس انتخاب کے تبصرہ کا آغاز کتاب کے ڈسٹ کور سے کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے چاروں طرف خوب صورت بیل کی جدول ہے اور درمیان میں غالب کی تصویر، جو صرف کتاب کے حسن ہی میں اضافہ نہیں کر رہی ہے بلکہ مرتب کے ذوق جمال کی بھی داد دے رہی ہے۔ شاید مسعود صاحب کے سامنے یہ مسئلہ ہوگا کہ غالب کی بہت سی تصویروں میں کس تصویر کا انتخاب کیا جائے جو شخص اور شاعر، کی نمائندگی کر سکے۔ قلعہ معلا کے نوادرات میں اس تصویر کا انتخاب مولف کی غالب شناسی کا ثبوت ہے۔ تصویر کے چہرے پر آفات زمانہ کی جھریاں ہیں مگر ان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے اس شعر نے اس تصویر کا جامہ پہن لیا ہے۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ۔۔۔ ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

غالب کی تصویر میں اگر آنکھوں کی طرف غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ نظریں ان کے افکار کا بدل ہو سکتی ہیں یا خود آئینہ فکر بن سکتی ہیں۔

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے ۔۔۔ وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں ۔۔۔ تاب اندیشہ نداری بہ نگاہ دریاب

اس انتخاب کے وقت مسعود صاحب کے سامنے ان کی مخصوص شعری تربیت اور "ذوق سخن" تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کا معیار انتخاب کا محرک یہ جذبہ بھی ہے۔

وہ (غالب) اپنے ابتدائی سرمائے یعنی وہ کلام جو بخط غالب اور نسخہ بھوپال پر مشتمل ہے، انصاف نہ کر سکے۔ اس دور کی شاعری کو انھوں نے 'مضامین خیالی'

---

[1] کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ۔۔۔ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

پر محمول کیا اور بقول خود اس کے صرف چند اشعار نمونے کے طور پر متداول دیوان میں رہنے دیئے۔ ایسا کرتے وقت وہ دلّی والوں کی اس بے تحاشا یلغار سے تنگ اور خائف ہو چکے تھے . . . . . جب انتخاب کا وقت آیا تو غالب کو 'رنگ بیدل' کے ریختے کے بیشتر نمونوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔"

اپنے انتخابی عمل میں مسعود صاحب نے دیوان غالب بخط غالب (نسخۂ عرشی زادہ) اور نسخہ رام پور (نسخہ عرشی) کو سامنے رکھا ہے اور غزلوں میں ردیف وار تاریخی ترتیب رکھی ہے [1] وہ لکھتے ہیں۔

" اس انتخاب میں بھی غالب کا کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ ردیف وار پیش کیا گیا ہے۔ قصائد، قطعات اور رباعیات کی ترتیب میں تاریخی التزام رکھا گیا ہے۔"

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ اس انتخاب کا محرک کون سا جذبہ تھا اور اس میں مؤلف نے کیا طریق عمل اختیار کیا ہے۔ اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اپنے اس انتخاب میں مسعود صاحب کہاں تک کامیاب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انتخاب اپنی نوعیت کا بالکل الگ انتخاب ہے تاریخی ترتیب سے غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اشعار جن کو بعض انتخابات میں نظر انداز کر دیا تھا مسعود صاحب کے توسط سے اہلِ ادب کے سامنے آ جائیں گے۔ جن کی چند مثالیں مسعود صاحب نے اپنے 'پیش کلام' میں دی ہیں۔

انتخاب کے سلسلے میں ایک سوال ضرور اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مسعود صاحب نے صرف ذوقِ جمال کے سہارے انتخاب کیا ہے تو بہت سے معمولی اشعار کیوں کر شامل کیے گئے اور بہت اچھے اشعار کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ مثلاً ایک غزل کے صرف تین شعر لکھے ہیں:

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مِری کہانی
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مِرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

---

[1] انتخاب کلام غالب (تاریخی ترتیب سے ردیف وار) از دیوانِ غالب بخطِ غالب ۱۸۱۶ء تا نسخۂ رام پور جدید ۱۸۵۵ء

مسعود صاحب نے غالب سے شکایت کی ہے کہ انھوں نے (غالب) نسخۂ بھوپال کے بہت سے "جواہر پاروں" سے صرف نظر کیا ہے۔ یہی شکایت مسعود صاحب سے بھی کی جا سکتی ہے کہ اس غزل کے کچھ شعر جن کو مولّف نے اپنے انتخاب میں شامل نہیں کیا ہے۔ وہ اشعار نہ صرف یہ کہ وہ شعری اعتبار سے منفرد ہیں بلکہ ان اشعار کے ساتھ مل کر ایک نئی فضا قائم کرتے ہیں۔ ان اشعار کو جدا کر دیجئے تو محسوس ہوگا کہ فضا بے رنگ سی ہوگئی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں 'قصیدہ فی المنقبت' کے عنوان سے شامل ہے موضوع کے اعتبار سے غالب نے اس کو قصیدہ (منقبت) کہا ہے مگر فارم کے اعتبار سے دو مطلعوں کے ساتھ غزل ہے۔ حاشیہ میں تحریر ہے: "مطبوعہ دیوان میں اس قصیدہ کے صرف دو مطلع اور ایک شعر غزلیات کے ضمن میں درج ہیں جو دم، سے ممتاز ہیں۔

بہ شکنجِ جستجو ہا، بہ سرابِ گفتگو ہا	تگ و تازِ آرزو ہا، ہمہ ذوق قصّہ خوانی
بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دوچار خامشی ہو	کہ نگاہِ سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی
مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی	ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب	کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

ان اشعار میں زبان پر غالب کی مہر لگی ہوئی ہے۔ شاید ان کو یہ اشعار اردو کے لیے عجیب معلوم ہوئے ہوں گے لیکن کیا اسی وجہ سے ان کو رائج دیوان میں نہیں رکھا گیا۔ اگر نظر انداز کرنے کا یہی سبب ہے تو ع

'تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا'

جیسے اشعار کو بھی خارج ہونا چاہیے تھا۔ بہر نوع نسخۂ حمیدیہ میں ان اشعار پر ایک خاص وجہ سے توجہ کی ضرورت تھی کہ ان میں غالب کے "پیچ تاب نفس" اور عارضی طور سے 'خاموشی' پھر اس کے بعد 'مہر سکوت' کا ٹوٹنا اور 'تخلیق فن' کا اظہار شروع ہو جاتا ہے۔ چناں چہ غالب کے نظریہ فن پر جہاں بحث کی جائے گی وہاں ان اشعار کو مدنظر رکھنا ضروری ہوگا۔

دوسری مثال غالب کی وہ غزل ہے جس کا مطلع ہے:

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا

اس غزل کے تین شعر ہیں۔ ان اشعار میں فارسی کی آورد مسلط ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ میر کی اس زمین میں غالب نے طبع آزمائی کی ناکام کوشش کی ہے۔[1] جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس زمین میں غالب کی کوئی دوسری غزل نہیں ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ یہ زمین فارسیت کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتی اس کے لیے ہندی کی سبک رفتاری کی ضرورت تھی۔ غالب کا مزاج فارسیت کا ہے لہٰذا وہ شاعری خواہ اُردو میں کریں مگر اپنے اس جذبۂ افتخار کو نہیں بھولتے۔ غالب نے اپنی متجسس طبیعت کے باعث اس زمین پر قدم رکھا مگر بعد کو اندازہ ہوا کہ اس زمین پر فارسیت کا پودا برگ وبار نہیں لائے گا تو وہ نہ صرف اس زمین سے دستبردار ہو گئے بلکہ اپنے انتخاب میں بھی شامل نہیں کیا۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسعود صاحب نے صرف سات صفحات کا 'پیش کلام' لکھا ہے جس کا مقصد صرف اپنے طریقِ کار کا اظہار اور ان اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ہے" جن کے چراغوں سے اپنا دیا روشن کیا ہے" مگر یہ دیا اتنا مختصر ہونے کے باوجود اتنا روشن ہے کہ دوسرے چراغ اس سے روشن کئے جا سکتے ہیں۔ شاید اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہوگا کہ اس دیباچہ میں بہت سے نکات ایسے ہیں جو انتخاب متن کے لیے مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

"اچھا شعر صرف دل کی ہائے اور دُہائی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ
'متانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال' کا بھی حامل ہوتا ہے۔"
"غالب کی سخن فہمی کا دم بھرتے وقت کسی قسم کی طرفداری کی ضرورت نہیں ہے"
"دوسری طرف ان کے (غالب) اسلوب شعر میں ایک دور رس تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ اسلوب شعر کے ساتھ معیارِ سخن بھی بدلا معیارِ سخن کے بدلنے کے ساتھ نظرِ انتخاب میں بھی تبدیلی آئی۔"

اس انتخاب میں کاما اور اعراب لگا دینے کی وجہ سے پڑھنے والے کو نہ صرف پڑھنے میں سہولت

---

[1] میر کی مشہور غزل: اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ہوگی بلکہ شعر کے سمجھنے میں بھی سہولت ہوگی۔ یہ کام بڑی ذمہ داری اور عرق ریزی کا ہے مگر خوشی ہے کہ مسعود صاحب نے اپنے پڑھنے والے کو زحمت سے بچانے کے لئے خود اس زحمت کو قبول کرلیا۔

انتخاب کلام غالب اگر ایک طرف شاعر کے فکر و فن کی نمائندگی کر رہا ہے تو دوسری طرف مؤلف کے حسن سلیقہ کی بھی داد دے رہا ہے۔ اس حسن و نفاست کے یا وصف کاتب کے مداخلت بے جانے متعدد جگہ شعر کو بگاڑ دیا ہے۔ کتابت کے اغلاط اگرچہ کم ہیں تاہم حسن مکمل کے لئے عیب میں ہی شمار ہوگا۔

کیا اچھا ہوتا کہ انتخاب کلام میں تاریخی ترتیب میں ہر غزل کے نیچے اس کی تاریخ بھی دیدی جاتی۔ موجودہ صورتحال میں ریسرچ کرنے والا صرف زمانہ کا تعین کرنے میں ممکن ہے کہ کامیاب ہوجائے مگر تاریخ کی قطعیت ممکن نہیں ہے، اسی کے ساتھ اگر ابتدا میں فہرستِ غزلیات بھی شامل کردی جاتی تو مزید سہولت ہوتی۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ غالبیات کے ذخیرہ میں یہ ایک دلچسپ اور مفید اضافہ ہے۔ اگر ایک طرف طلبہ اور اساتذہ کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے تو دوسری طرف محققین غالب کے لیے تحقیق کا راستہ متعین کرنے میں اس سے مدد فراہم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ مسعود صاحب اس انتخاب کا دائرہ وسیع کریں گے اور اس طرح غالب شناسی کے لئے نئے امکانات کی نشاندھی ممکن ہوسکے گی۔ یہ صرف غالب کے طرفداروں، پر احسان نہیں ہوگا بلکہ ادب کے سخن فہم، بھی ممنونِ کرم ہوں گے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

پروفیسر مسعود حسین خاں کی لسانی خدمات

پروفیسر مسعود حسین خاں کی علمی و ادبی دنیا میں کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ اُردو کے ایک مایۂ ناز محقق، مشہور نقاد اور شاعر، ماہرِ دکنیات اور ماہرِ اسلوبیات نیز لغت نگار اور بلند پایہ انشا پرداز ہیں۔ ان تمام حیثیتوں کے علاوہ اُن کی ایک حیثیت ماہرِ لسانیات کی بھی ہے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مسعود صاحب ہندوستان کے صفِ اوّل کے ماہرینِ لسانیات میں سے ہیں۔ ان کا شمار بلا شبہ بیسویں صدی کے ممتاز ہندوستانی ماہرینِ لسانیات مثلاً کمار چٹرجی، سکمار سین، ایس۔ ایم کترے، دھیرندر ورما، بابو رام سکسینہ، اشوک کیلکر، پی۔ جی پنڈت اور جی۔ ایچ کرشنا مورتی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے ماہرینِ لسانیات میں تو ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ بلا شبہ وہ اس عہد کے اُردو کے سب سے بڑے لسانی محقق ہیں۔

اُردو میں لسانی تحقیق کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق قدیم Philology سے ہے جسے علم السنہ کہتے ہیں۔ یہ زبانوں کے مطالعے کا قدیم انداز ہے جس میں زیادہ تر الفاظ کی تحقیق، اس کے مآخذ اور اس کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، نیز قدیم متون کی تشریح میں الفاظ کے اشتقاقی پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ زبانوں کے مطالعے کا دوسرا انداز جدید لسانیاتی انداز ہے جس میں زبانوں کا مطالعہ سائنسی انداز پر کیا جاتا ہے جس میں زبان کی ساخت کی توضیح شامل ہے۔ اس قسم کے مطالعے کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے، جسے ساختیاتی لسانیات کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یورپ میں لسانیاتِ جدید کا ارتقا فرڈینینڈ ڈی سیور کی کتاب Course in

General Linguistics کی اشاعت سے ہوتا ہے جو ۱۹۱۵ء میں اس کے مصنف کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے لسانیات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا کیوں کہ اس میں بعض ایسے نظریات پیش کیے گئے تھے جو پہلی بار سامنے آئے تھے اور انیسویں صدی میں فروغ پانے والے زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعات سے حد درجہ مختلف تھے۔ ڈی سیور کی اس کتاب نے زبانوں کے جدید اور قدیم مطالعوں کے درمیان فصیل کھینچ دی یہی وجہ ہے کہ اُسے آج لسانیاتِ جدید کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈی سیور کے بعد لسانیات کے میدان میں دوسری قدآور شخصیت امریکی اسکالر بلوم فیلڈ کی ہے جس کی کتاب Language نیویارک سے ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی اس کتاب کی اشاعت سے لسانیاتِ جدید کا ایک نیا باب وا ہوا اور زبانوں کا مطالعہ بالکل نئے اور منظم انداز سے کیا جانے لگا۔ توضیحی لسانیات مختلف سطحات کا واضح تصور اور تعین بھی پہلی بار بلوم فیلڈ کے یہاں ملتا ہے۔ بلوم فیلڈ کے اثرات بعد کے ماہرینِ لسانیات پر بہت گہرے پڑے اور یہ علم تیزی کے ساتھ ترقی کرتا گیا بعد کے دور میں Noam Chomsky نے ۱۹۵۷ء میں اپنی کتاب Synlactic Structure کی اشاعت سے تشکیلی قواعد کا جو نظریہ پیش کیا اس نے لسانیات کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ جدید لسانیات کے ارتقا میں ڈی۔ سیور، بلوم فیلڈ اور نوام چومسکی کے نظریات کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

ادھر انگلستان میں J.R. Firth کی تحریروں سے جدید لسانیاتی نظریات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ Firth کی کتاب Papers in Linguistic ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی جس سے لسانیات کے لندن اسکول کی بنیاد پڑتی ہے۔ فرتھ ماہر بشریات مالینواسکی کے ساتھ کام کر چکا تھا جسے زبان اور کلچر کے باہمی رشتے سے گہرا شغف تھا۔ اسی کے نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے J.R. Firth نے زبان کو سماجی سیاق و سباق میں رکھ کر مطالعے کی کوشش کی اور اس سے متعلق Context of Situation کا ایک جدید نظریہ پیش کیا Firth کا دوسرا نظریہ عروضی Prosodic نظریہ کہلاتا ہے جو ایک جدید صوتیاتی نظریہ ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں جدید ماہر لسانیات ہیں کیونکہ انھوں نے پورا یورپ اور امریکہ میں بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں فروغ پانے والے تمام جدید لسانیاتی نظریات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنی

تحریروں میں ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے جس وقت جدید لسانیاتی موضوعات و مسائل پر لکھنا شروع کیا اس وقت اُردو میں سید محی الدین قادری زور کی تحریروں کے علاوہ کوئی دوسرا نمونہ موجود نہیں تھا۔ زورؔ صاحب نے فرانس میں رہ کر لسانیات کی تربیت حاصل کی تھی اور ۱۹۳۰ء میں ایک کتاب Hindustani Phonetics کے نام سے انگریزی میں لکھی تھی۔ ان کی دوسری کتاب ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ زورؔ صاحب کی تحریروں کے علاوہ اس دور میں کوئی اور تحریر نظر نہیں آتی جسے جدید لسانیاتی تناظر میں رکھا جاسکے۔ زورؔ صاحب سے ذرا پہلے ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود خاں شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" شائع ہوئی تھی، لیکن اسے کئی وجہوں سے جدید لسانیات کی کتاب نہیں کہا جاسکتا۔ مسعود صاحب کو یہ اوّلیت حاصل ہے کہ انھوں نے اُردو میں جدید لسانیاتی مطالعات کو فروغ دیا اور جو نئے لسانی نظریات یورپ اور امریکہ میں فروغ پا رہے تھے انھیں اُردو میں عام کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے لسانیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان، فرانس اور امریکہ کا بھی سفر کیا۔ وہ سب سے پہلے ۱۹۵۰ء انگلستان گئے اور وہاں کے School of Oriental and African Studies کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا پھر ۱۹۵۱ء میں وہ فرانس گئے اور وہاں کے دو سالہ قیام کے دوران لسانیات میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں وہ امریکہ کی Association of Asian Studies کے زیرِ اہتمام آسٹن اور ہارورڈ یونیورسٹی گئے۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے دوران مسعود صاحب نے امریکہ کا ایک اور علمی سفر کیا اور وزٹنگ اسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ یورپ اور امریکہ میں اپنے قیام کے دَوران ماہرینِ لسانیات و اسلوبیات مثلاً جے۔ آر فرتھ، جان گمپرز، آرکی بالڈ اے ہل اور آئی۔ اے رچرڈ وغیرہ سے علمی استفادہ کیا جس کی جھلک ان کی بعد کی لسانی تحریروں میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی لسانی خدمات کے کئی پہلو ہیں جن میں تاریخ زبان اُردو، صوتیات، اسلوبیات، دکنیات اور قدیم متون کے لسانی مطالعے کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کے علاوہ مسعود صاحب نے زبان کی سماجی اور تہذیبی اقدار پر بھی کافی لکھا ہے اور زبان کے

سماجی لسانیاتی پہلوؤں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ تدوینِ لغت اور اردو رسمِ خط کے مسائل سے بھی مسعود صاحب کو خصوصی دلچسپی رہی ہے۔

مسعود صاحب کا سب سے بڑا لسانیاتی کارنامہ ان کی تحقیقی کتاب "مقدمۂ تاریخِ زبانِ اُردو" ہے جس میں پہلی بار اُردو زبان کے تمام ممکنہ مواد کو جدید لسانیات کی کسوٹی پر پرکھ کر اردو کے آغاز کے بارے میں ایک ٹھوس نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ یہ مسعود صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۴۸ء میں شایع ہوا لیکن اس وقت سے لے کر اب تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں اُردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں مسعود صاحب نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ قدیم اُردو کی تشکیل براہِ راست دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جانے والی ہریانوی بولی سے ہوئی ہے لیکن یہ کھڑی بولی کی بنیادوں پر معیاری بنائی گئی ہے۔ مسعود صاحب نے اپنے نظریے کا اعادہ اپنی بعض دیگر تحریروں میں بھی کیا ہے لیکن مقدمہ تاریخ زبان اُردو کے بعد کے تین ایڈیشن نکلے ہیں ان میں انھوں نے اپنے اس نظریے میں تھوڑی ترمیم کی ہے اور پچھلے اٹھائیس سال کی نئی معلومات کی روشنی میں بعض ابواب کو پھر سے لکھا ہے۔ انھوں نے امیر خسرو کی مثنوی "نہ سپہر" میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے زبان دہلی اور پیرامنش یعنی دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں کو اُردو کا سرچشمہ ثابت کیا ہے اس طرح ہریانوی اور کھڑی بولی دونوں کو اُردو کے آغاز و ارتقا میں برابر کا حصہ دار قرار دیا ہے۔ ان کی ابتدائی تحقیق میں اُردو کے آغاز کے سلسلے میں نواحِ دہلی کی ہریانوی بولی پر زیادہ زور تھا لیکن کھڑی بولی کی اہمیت کے پیشِ نظر مسعود صاحب نے یہ تسلیم کر لیا کہ اُردو کے ارتقا میں کھڑی بولی کی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ ہریانوی بولی کا۔ مسعود صاحب کی اس لسانی تحقیق کا ایک پہلو یہ ہے کہ حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں اردو کے پنجابی زبان سے نکلنے کا جو نظریہ پیش کیا تھا اسے باطل قرار دیا جائے اور اس میں مسعود صاحب کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ شیرانی نے قدیم اُردو بالخصوص دکنی اُردو کی جن صوتیاتی، نحوی اور دیگر لسانیاتی خصوصیت ہریانوی بولی میں موجود تھیں۔ دہلی سے ہریانوی کا علاقہ پنجابی کے علاقے سے قریب تر ہے لہٰذا قدیم اُردو کی یہ خصوصیات ہریانوی بولی کی ہی ہو سکتی ہیں نہ کہ پنجابی کی۔ مسعود صاحب نے یہ بات بھی

قطعی طور پر حل کر دی کہ اُردو کی پیدائش دہلی اور نواح دہلی میں ہوئی ورنہ اس سے پہلے کوئی اسے سندھ سے منسوب کرتا تھا تو کوئی پنجابی سے اور کوئی دکن سے۔ اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں ہریانوی بولی کی اہمیت اور اس کے عمل دخل کے بارے میں تمام معلومات اور تفصیلات مسعود صاحب نے خود فراہم کیں اور ہریانوی بولی کا دکھنی اُردو اور کھڑی بولی سے خود تقابلی مطالعہ کیا اور اُردو کے آغاز کے بارے میں ایک قابل قبول نظریہ پیش کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُردو اور ہریانوی بولی کے رشتے کا ذکر سب سے پہلے نہ رول بلاک نے اپنی تحریروں میں کیا تھا بعد کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں اُردو پر ہریانوی زبان کے اثرات کا ذکر کیا لیکن یہ تمام باتیں صرف مفروضوں اور نیم صداقتوں کی حد تک تھیں مسعود صاحب نے پہلی بار اس مفروضے کو لسانیاتی کسوٹی پر کسا اور بے شمار لسانی شہادتوں، تجزیوں اور تقابلی مطالعات کی بنیاد پر خود اپنے لسانی نظریے کی تشکیل کی۔ اُردو کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں اب تک بے شمار نظریات پیش کیے جا چکے ہیں لیکن جس تحقیقی استدلال اور جدید لسانیاتی بصیرت کے ساتھ مسعود صاحب نے اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں تحقیق کی ہے اس پایے کی کوئی اور تحقیق ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔ اُردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں مسعود صاحب کا نظریہ لسانیات کی دنیا میں آج بھی سب سے زیادہ معتبر اور قابل قبول نظریہ ہے۔

ایک دوسرا میدان جس کی طرف مسعود صاحب نے خصوصی توجہ دی ہے اُردو صوتیات ہے۔ مسعود صاحب نے ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک انگلستان اور فرانس میں اپنے قیام کے دوران J.R. Firth کے عروضی صوتیات کے نظریے کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا۔ ان کی یہ تحقیقی کاوش ۱۹۵۴ء میں شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے A Phonetic and Phonological Study of the Word کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

اس کتاب کا راقم الحروف نے "اُردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ" کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا جو ۱۹۸۶ء میں شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا۔ اگرچہ عروضی صوتیات کا نظریہ بنیادی طور پر J.R. Firth کا ہے لیکن مسعود صاحب نے اس کا اُردو پر اطلاق کرتے وقت اس میں جو جامعیت اور وسعت پیدا کی ہے وہ ان کا اپنا کارنامہ ہے عروضی صوتیات

دراصل اُردو کے لیے ایک نئی اصطلاح ہے جس کا شاعری کے علم عروضی سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کا تعلق ان عروضی خصوصیات سے ہے جو صوتیاتی اکائیوں مصمتوں اور مصوتوں پر قوس کی صورت میں پھیلی ہوتی ہیں۔ عروضی خصوصیات، صوت رُکن، لفظ اور جملہ تینوں پر محیط ہوتی ہیں کیونکہ صوتیاتی اکائیوں سے ہی صوت رُکن اور لفظ ترتیب پاتے ہیں اور لفظ سے جملے۔ عروضی خصوصیت دراصل ایک قسم کی صوتی خصوصیت ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ صوتیاتی خصوصیت جس کا تعلق اُفقی Synlagmatic طور پر ایک سے زیادہ صوتی اکائی سے ہوا سے عروضی خصوصیت کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو لفظ کا عروضی خصوصیات کی روشنی میں مطالعہ پروفیسر مسعود حسین خاں کا ایک گراں قدر علمی کارنامہ ہے اور لسانیاب بالخصوص توضیحی لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے مسعود صاحب کا یہ علمی کام اتنا جامع اور ٹھوس ہے کہ اس پر آج تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوسکا۔

اُسلوبیات ایک دوسرا اہم علمی میدان ہے جس پر مسعود صاحب نے خصوصی توجہ دی ہے۔ اسلوبیات دراصل ادب پر لسانیات کے اطلاق کا نام ہے زبان چونکہ ادب کا ذریعۂ اظہار ہے اور زبان لسانیات کا مواد و موضوع بھی ہے، اس لیے ادب اور لسانیات میں گہرے رشتے کا پایا جانا لازمی ہے۔ ادب اور لسانیات کے اسی گہرے رشتے پر غور و خوض کو اسلوبیات کا نام دیا گیا ہے اسلوبیات سے مسعود صاحب کو اس وقت سے دلچسپی پیدا ہوئی جب وہ امریکہ گئے اور وہاں انھوں نے امریکی ماہر اسلوبیات آرکی بالڈ ہل کے لیکچرز میں شریک ہوئے۔ پروفیسر ہل آسٹن یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے استاد تھے لیکن ادب کی افہام و تفہیم کے لیے لسانیات سے مدد لیتے تھے۔ مسعود صاحب علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے اور یہاں تنقید کا جو معیار تھا اس سے وہ مطمئن نہیں تھے مسعود صاحب اپنی خود نوشت سوانح حیات "ورودِ مسعود" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

پروفیسر ہل کے لیکچروں میں جن میں میں پابندی سے حاضری دیتا تھا وہی پایا جس کی مجھے تلاش تھی، یعنی لسانیات اور ادب کو کس طرح ہم دگر کیا جا سکتا ہے۔ میں ادبی تنقید کی فقرے بازی اور قول محال سے بیزار تھا مثلاً "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالب" غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، جن فقروں پر لوگ سر دھنتے تھے میری سمجھ میں ان کا

مفہوم نہیں آتا تھا میں زیادہ سے زیادہ انھیں انشا پردازی کہہ سکتا ہوں ادبی تنقید ہرگز نہیں۔

پروفیسر ہل کے لکچروں سے مسعود صاحب کے تنقیدی رویے میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی ہندوستان واپس آ کر انھوں نے اسلوبیات سے متعلق اُردو میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس قسم کے بعض مضامین ان کی کتاب "شعر و زبان" (۱۹۶۶ء) میں شامل ہیں۔ اسلوبیات کے نظری پہلوؤں کو اُردو میں عام کرنے کے علاوہ مسعود صاحب نے اسلوبیاتی تجزیوں کے بہترین نمونے بھی پیش کیے۔ جن میں غالب، اقبال اور فانی کے کلام کے تجزیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلوبیاتی مطالعہ و تجزیے کا ایک بہترین نمونہ ان کی کتاب "اقبال کی نظری و عملی شعریات" میں ملتا ہے۔ اسلوبیات کے میدان میں مسعود صاحب نے جو بھی کام کیا ہے اسے اولیت کا درجہ حاصل ہے کیونکہ مسعود صاحب ہی وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے اُردو میں اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد ڈالی اور ادبی تنقید کی ایک نئی جہت سے اُردو والوں کو روشناس کرایا۔ اسلوبیات کے موضوع پر بعد کے تمام لکھنے والوں نے مسعود صاحب کی ہی تحریروں سے تحریک حاصل کی۔ آج بھی اُردو میں اسلوبیات کا ذکر مسعود صاحب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

اُردو کے لسانی موضوعات میں دکنیات بھی اہم موضوع رہا ہے۔ اُردو کے جن عالموں نے دکنیات کی جانب توجہ دی ہے ان میں مسعود صاحب کا نام قابل قدر اہمیت کا حامل ہے۔ مولوی عبدالحق اور سید محی الدین قادری زور کے بعد اگر دکنیات کی طرف کسی نے خصوصی توجہ دی ہے تو وہ مسعود صاحب ہی ہیں۔ دکنیات سے مسعود صاحب کی دلچسپی کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے کئی دکنی متون کو سائنٹفک طرز پر ایڈٹ کیا ہے۔ جس میں "ابراہیم نامہ" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حیدرآباد میں اپنے قیام کے دوران مسعود صاحب نے قدیم اُردو کی تین جلدیں شائع کیں جن کے ذریعے دکنی ادب کے کئی گمنام شہ پارے منظر عام پر آئے۔ "دکنی اُردو کی لغت" کی تدوین بھی مسعود صاحب کا ایک بے مثل کارنامہ ہے اس کے علاوہ مسعود صاحب نے دکنی اُردو کے لسانیاتی پہلوؤں پر بھی متعدد مضامین لکھے ہیں اور اپنی کتاب "محمد قلی قطب شاہ" میں قلی قطب شاہ کے کلام کا لسانیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔

دکنی متون کی تدوین کے علاوہ مسعود صاحب نے شمالی ہند کے قدیم متون مثلاً "قصۂ مہر

افروزودلبر" "بکٹ کہانی" اور "عاشور نامہ" کی تدوین کا کام بھی سرانجام دیا ہے ان کے مقدمات میں انھوں نے متون کی لسانی خصوصیت کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔

مسعود صاحب کو اردو کے سماجی لسانیاتی اور تہذیبی پہلوؤں سے بھی خصوصی دلچسپی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً وہ ان موضوعات پر بیباکانہ انداز میں لکھتے رہے ہیں۔ زبان کو وہ ایک تہذیبی اور معاشرتی عمل تصور کرتے ہیں اور اردو کو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ہر جماعت یا گروہ کی زبان کے عروج و زوال سے اس گروہ کی تقدیر وابستہ ہوتی ہے۔ زبان کی موت ایک گروہ کی تہذیبی موت سے عبارت ہے"۔ مسعود صاحب مادری زبان کی اہمیت پر بھی زور دیتے رہے ہیں اور اردو داں طبقے کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کی وکالت کرتے رہے ہیں اپنے متعدد مضامین اور ہماری زبان کے اداریوں میں اردو کے سلسلے میں کی جانے والی بے انصافیوں کے خلاف بڑی بیباکی اور جرأت مندی کے ساتھ آواز اٹھائی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے اور اردو کے دستوری اور جمہوری حقوق کے حصول کے لیے جنگ لڑی ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۲ء کے دوران جو اداریے لکھے ان کی یاد بہت سے ذہنوں میں آج بھی تازہ ہے۔

سیّد انور سعید

پروفیسر مسعود حسین خاں

جامعہ اُردو کی ایک تاریخ ساز شخصیت

"بزم اقبال" آگرہ کے زیر اہتمام جب ۱۹۳۹ء میں جامعہ اُردو کا قیام عمل میں آیا ہوگا تو ارباب حل وعقد نے یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ محدود مقاصد کے ساتھ مختصر وسائل کی بنیاد پر قائم یہ ادارہ کبھی ملک گیر ہی نہیں، بین الاقوامی شہرت کے ساتھ مشرقی و مغربی ممالک میں اپنے امتحانی مراکز قائم کر سکے گا۔ اور آج اس کے دائرہ کار کی وسعت سات سمندر پار تک پہنچنے کے لیے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کا تعلق جامعہ اُردو سے مختلف حیثیتوں سے تقریباً اسی زمانے سے قائم ہے جب ۱۹۴۸ء میں ظہیر الدین علوی صاحب مرحوم نے باد مخالف کے تلاطم میں گھرے ہوئے سفینۂ جامعہ کے بادبان کا رُخ آگرہ سے علی گڑھ کی جانب موڑا تھا اور اس طوفان زدہ کشتی کا ناخدا بن کر اسے بارگاہ سرسیدی میں علی گڑھ لے آئے تھے۔ جہاں شعبۂ اُردو کے قریب سرسیّد ہال کے ایک کمرہ میں جامعہ کا دفتر قائم کیا گیا اور دفتر کا عملہ رجسٹرار صاحب کے ساتھ ایک کلرک چپراسی پر مشتمل تھا۔ امتحانی مراکز کی تعداد ۱۹ اور امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ وطالبات کی مجموعی تعداد ۳۳۲ تھی۔ اور آج جب دفتری ملازمین اور مختلف عہدیداران کے ساتھ امتحانات کے مراکز اور طلبا کی تعداد پر غور کیا جاتا ہے تو نظر آتا ہے کہ اس کے پس پردہ یقیناً کوئی ایسی فعال شخصیت ہوگی جس کی دور رس نگاہیں جامعہ اُردو کی ترقی اور بہبود کے لیے متواتر راہیں تلاش کرتی رہی ہوں گی۔ بلاشبہ جامعہ اُردو کی اس ترقی و توسیع کے لیے جامعہ سے وابستہ

نامور اربابِ حل وعقد اور عہدیداروں کے علاوہ مجلس عام، مجلس منتظمہ اور کمیٹیوں کے اراکین میں شامل ان برگزیدہ شخصیات اور اہل علم کی گراں بہا خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے جامعہ کی بنیادوں کو ہی مستحکم نہیں کیا بلکہ اس کے وقار کو بھی بلند کیا ایسی ہی شخصیات میں پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کا اسمِ گرامی بھی اس خصوصیت کے ساتھ شامل ہے کہ جامعہ سے ان کی وابستگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں جامعہ کے ایک ممتحن کی صورت میں ہوا تھا۔ اور مختلف مجالس میں رکنیت کے ساتھ ساتھ یہ وابستگی مستحکم تر ہوتی گئی حتیٰ کہ آج سے ۲۲ سال قبل پروفیسر رشید احمد صدیقی (مرحوم) کی تحریک پر ۱۹۷۳ء میں ان کو جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے ممتاز منصب پر فائز کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت تک جامعہ کے دفتر کی موجودہ عمارت تعمیر ہو چکی تھی اور طلبہ و طالبات کی تعداد بھی بڑھ چکی تھی (۱۹۷۳ء میں آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار اور خرچ ایک لاکھ چھیالیس ہزار تھا اور ۱۹۹۴ء میں آمدنی -/۲۴,۸۰,۰۰۰ روپے اور خرچ -/۲۱,۰۰,۰۰۰ روپے ہو گیا۔)

لیکن ترقی و توسیع کی اگلی راہوں کو ہموار کرنے اور امتحانات کے معیار کے ساتھ جامعہ کے وقار کو بلند کرنے کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو خود اُردو تہذیب کا علمبردار اور اُردو ادب کا ترجمان بھی ہو۔ جامعہ اُردو کے نشیب و فراز سے واقفیت کے ساتھ جامعہ کی فلاح و بہبود کی دلی تمنا بھی رکھتا ہو۔ اور اُردو کے علمی و ادبی میدان کا مردِ مجاہد ہی نہیں دفتری انتظامات Administration کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل بھی ہو۔ اور یہ سب خصوصیات بیک وقت پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کی شخصیت کا جزو ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے نہ صرف ایک متبحر عالم، بلند مرتبہ ادیب، اعلیٰ مرتبت انشا پرداز، باکمال آپ بیتی نویس، مکتوب نگار، سیرت نگار، شخصیت نگار، مرقع نگار، مستند مورخ، معتبر نقاد، ماہر لسانیات، عالمِ صوتیات، مبصر دکنیات اور سخن فہم و سخن سنج اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک تجربہ کار اور با صلاحیت منتظم Administrator بھی ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ دفتری امور کی بہترین کارکردگی کے ساتھ ساتھ مالیاتی مسائل پر بھی آپ کی گہری نظر رہتی ہے۔ ان تمام امور سے قطع نظر مسعود صاحب اپنے شاگردوں کے شفیق اور چہیتے استاد بھی ہیں۔ آپ خود علی گڑھ کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔

اور آپ کے فیض علم سے علی گڑھ، دہلی، حیدرآباد، سری نگر اور نہ معلوم کہاں کہاں ان گنت تشنگان علم سیراب ہوتے رہے ہیں۔

مسعود صاحب کے ہزارہا شاگرد مشرق و مغرب کے مختلف ممالک میں نہ صرف علمی و ادبی میدانوں میں بلکہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اپنے استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ مجھے بھی مسعود صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ لسانیات کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے موصوف کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور ان ہی کے فیض تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہے کہ میں قلم پکڑنے کے قابل بنا۔ اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رجسٹرار جامعہ اُردو کی حیثیت سے مسعود صاحب کے ساتھ کام کرنے بلکہ ان سے کام سیکھنے کا پچھلے چار سال سے موقع ملا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں میں نے مسعود صاحب کی انتظامی صلاحیتوں اور جامعہ کی فلاح و بہبود اور ترقی و توسیع کے سلسلہ میں ان کی دوررس اسکیموں اور منصوبوں کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان کے تجربات سے بہت کچھ سیکھا اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی نسبت سے مسعود صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے۔ لیکن اس سے قبل یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسعود صاحب کی اُردو زبان و ادب سے متعلق ادبی، لسانی، تحقیقی، تنقیدی اور شعری تخلیقات و تالیفات اور ادبی تجربات کے علاوہ مضامین، مکتوبات اور دوسری تحریرات کا اشارتاً ذکر کیا جائے تاکہ ان کی عالمانہ اور فاضلانہ شخصیت کے نقوش بھی ابھر سکیں۔

مسعود صاحب کو اُردو زبان و ادب سے ایک والہانہ محبت ہے اور وہ اسے اپنا مقدر تصور کرتے ہیں چنانچہ اپنی خود نوشت سوانح حیات "ورودِ مسعود" میں ایک جگہ انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ "اُردو کو میں نے پیشہ کے طور پر اختیار کیا تھا اور وہ میرا مقدر بن گئی۔" اس سلسلے میں مسعود صاحب کے ایک ایسے مطبوعہ مقالہ کے چند اقتباسات کی جانب اشارہ کرنا چاہوں گا جو مسعود صاحب نے ۱۹۵۶ء میں جے پور میں منعقد کل راجستھان اُردو کانفرنس کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اور اس کا حوالہ مذکورہ کانفرنس کی روداد کے علاوہ مسعود صاحب سے متعلق کسی کتاب یا مضمون میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ مذکورہ کانفرنس انجمن ترقی اُردو راجستھان کی جانب

سے ۲۹ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بمقام جے پور منعقد ہوا تھا اور کانفرنس کی روداد انجمن مذکور کے جنرل سیکرٹیری الحاج مولانا احترام الدین شاغل عثمانی مرحوم نے مرتب کر کے الجمعیتہ پریس دہلی میں ستمبر ۱۹۵۶ء میں طبع کرا کے شائع کی تھی۔ اس روداد میں انجمن ترقی اُردو راجستھان کی کارکردگی، کانفرنس کے اغراض و مقاصد، کانفرنس میں منظور شدہ تجاویز اور دیگر تفصیلات کے علاوہ سمینار کے چار عنوانات پر مقالے بھی پڑھے گئے مقالات، تین روزہ چلنے والے مشاعرہ کا منتخبہ کلام، شعراء و ادبا کے مختصر حالات مع فوٹو، علمی اور ادبی نمائش میں پیش کردہ مخطوطات کی وضاحتی فہرست اور آمد و خرچ کا حساب بھی شامل ہے۔ کہنے کو تو یہ کل راجستھان کانفرنس تھا مگر حقیقت میں کل ہند سطح کی ایک ایسی تین روزہ تقریب تھی جس میں راجستھان کے نامور ادیب، شاعر اور ہمدردان اُردو نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ ان ہی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ اس زمانے میں آپ شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ریڈر کے عہدے پر فائز تھے۔ مسعود صاحب نے "ہندوستان کی مسلّمہ زبانوں میں مقابلتاً اُردو کی رفتار، ماضی و حال اور مستقبل کی توقعات" پر اپنا فکر انگیز اور بصیرت افروز مقالہ پیش کیا تھا۔ اور اُس دور کی صورت حال میں اُردو کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بقا، ترقی، توسیع اور تحفظ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"اُردو کے حق کو منوانے کے لیے اور اس کے جینے کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے ہر رنگ کے جتن کرنے ہوں گے، سمجھانا ہوگا، جتانا ہوگا، ماننا ہوگا اور منوانا ہوگا راج ہٹ کا مقابلہ جنتا ہٹ سے کرنا ہوگا۔"—

"اُردو بچاؤ کی لڑائی کے دو محاذ ہوں گے۔ ایک طرف ہمیں نئے سرے سے اعتماد اور ساکھ قائم کرنا ہے۔ ہمیں اپنے پڑوسی کو سمجھانا ہوگا یہ ہماری مادری زبان ہے اور ہمیں اسی طرح عزیز ہے جس طرح بنگالی کو بنگالی اور پنجابی کو پنجابی، یہ ہمارا دستوری حق ہے"—

ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو سماج اپنی تنظیم پر پھر سے اُٹھ کھڑا ہو اور اس کے لیے مسعود صاحب نے اُردو سماج کو تعلیم نسواں کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت پر

زور دیا ہے اور اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے اپنے دلائل پیش کرنے کے ساتھ اور زبان کی ترقی و توسیع کے لیے ملک کے لسانی حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اسے آسان بنانے اور اس میں ہندوستانی لسانی عناصر کو شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور اُردو کے رسم الخط کی اہمیت کو آپ نے دلائل کے ذریعہ تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ :

" اس کے بغیر اُردو کی شکل پہچاننا مشکل ہے "

اُردو سے والہانہ محبت اور اپنے جذبۂ شوق کا اظہار کرتے ہوئے مقالہ کے آخر میں مسعود صاحب نے فرمایا ہے کہ ــــ

" اُردو کی مدافعانہ لڑائی کا تمام تر انحصار اس جذبۂ بے اختیار شوق پر ہوگا جس کی بنا پر شمشیر کا دم سینۂ شمشیر سے باہر ہوتا ہے اس زبان کو تحفظ، تدابیر تحفظ سے بھی پہلے منحصر ہے اس بات پر کہ اس کے لیے ہمارے دل میں لگن کہاں تک ہے؟ وہ ہمیں کہاں تک عزیز ہے اور اس عزیزۂ ہند کی خاطر ہم کیا کچھ سہنے کو تیار ہیں " ــــ

مسعود صاحب کے مذکورہ بیانات سے اُردو کی بقا، اس کے تحفظ اور اس کی ترقی و توسیع کے لیے ان کے دل کی لگن اور چبھن کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر مسعود صاحب نے اپنے مخصوص لسانیات کے میدان کو اشہب اُردو کی جولانگاہ بنایا۔ " مقدمۂ تاریخ زبان اُردو " کے موضوع پر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر فرمایا۔ مقدمۂ تاریخ زبان اُردو تصنیف کی۔ اُردو زبان و ادب سے متعلق اپنے مضامین کے مجموعے شائع کیے " قدیم اردو " کے پروجیکٹ پر کام کر کے چار جلدیں شائع کرائیں۔ دکنی اُردو کی لُغت مرتب کی۔ ہماری زبان کے اداریے اور انشایے لکھے جس کا مجموعہ " اُردو کا المیہ " کے عنوان سے شائع ہوا۔ ترقی اُردو بورڈ کی لسانیات کی اصطلاحات کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اصطلاحات سازی کا کام انجام دیا۔ اُردو لفظ کے صوتیاتی اور تجزِ صوتیاتی مطالعہ سے متعلق انگریزی زبان میں بصیرت افروز مقالہ لکھا جس کا اُردو ترجمہ (مترجم ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

شائع ہوچکا ہے۔

ماہر لسانیات کی حیثیت سے مسعود صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر آج اُردو کے کسی طالب علم سے بلکہ اُردو کے استاد سے یہ پوچھا جائے کہ عہد حاضر میں اُردو کے کسی عظیم ماہر لسانیات کا نام بتائیں تو یقیناً مسعود صاحب ہی کا نام لیا جائے گا۔اس لیے مسعود صاحب سے پہلے خواہ ڈاکٹر گریرسن نے اپنی تصنیف ——— Languistic of India Survay میں اُردو کا ذکر کیا ہے خواہ ڈاکٹر محی الدین زور نے اُردو لسانیات پر کام کیا ہو یا پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب میں اُردو لکھی ہو،مسعود صاحب کا اپنا کام ہے۔

اس کے علاوہ مسعود صاحب نے مختلف ادبی موضوعات پر درجنوں مضامین لکھے جو ملک کے مُقتدر رسائل وجرائد کی زینت بنے۔

مسعود صاحب کی نثر ونظم میں تصانیف،تخلیقات،تالیفات،مقدمات،تجزیات مقالات،مضامین،مکاتیب،آپ بیتی نگاری،سیرت نگاری،شخصیت نگاری،ذہنی متون کی ترتیب وتدوین،ان کی تحقیق،تنقید،تاریخ اور بالخصوص لسانیاتی تخلیقات کے علاوہ ان کی حیات وشخصیت سے متعلق مختلف کتابوں اور رسائل وجرائد میں اہل علم اور ارباب ادب کے مضامین شائع ہوتے رہے ان بکھری ہوئی تحریرات سے قطع نظر مرزا خلیل احمد بیگ نے "نذر مسعود" کے نام سے مسعود صاحب کی حیات وشخصیت اور علمی وادبی کارناموں پر مشتمل اُردو کے نامور اہل قلم کے مضامین کا جو مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے وہ مسعود صاحب کی اعلیٰ وارفع شخصیت اور ان کے علمی وادبی کارناموں کو سمجھنے کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے یہ مجموعہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد سے اب تک مسعود صاحب کے رشحاتِ قلم کا تجزیہ ایک جداگانہ تحقیقی کام سے کم نہیں۔بالخصوص "انتخاب کلام غالب ۱۹۹۱ء انتخاب کلام اقبال (۱۹۹۵) اور اُردو غزل کے نشتر (۱۹۹۵) انفرادیت کے حامل ہیں۔

ایسی صورت میں جب کہ ۱۹۸۹ء تک کے ادبی کارناموں کی دستاویز مرتب ہوچکی ہے ان کے بارے میں کچھ لکھنا تکرارِ موضوع کے مترادف ہوگا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "نذر مسعود"

حرفِ آخر ہے اس وقت تک مسعود صاحب کی علمی ادبی خدمات کے بہت سے گوشے اجاگر کرنے کی گنجائش ہے۔ اور اس کے بعد کی تخلیقات کا تجزیہ ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے لہٰذا طوالتِ مضمون کو مدِنظر رکھتے ہوئے جامعہ کی نسبت سے مسعود صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیساکہ سطورِ بالا میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جامعہ اُردو سے مسعود صاحب کی وابستگی کا سلسلہ ۱۹۴۸ء سے قائم ہے گویا اگر مسعود صاحب کی زندگی کے ۷۵ سالہ ماہ و سال کی روشنی میں جامعہ اُردو سے تعلق کا زمانہ متعین کیا جائے اور بالخصوص تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۴۳ء میں بحیثیت لکچرر شعبہ اُردو ملازمتی زندگی کے آغاز سے اب تک کے عرصہ کا شمار کیا جائے تو شروع کے پانچ سال کو چھوڑ کر ۵۲ سال میں ۴۸ سال سے متواتر ان کی جامعہ اُردو سے کسی نہ کسی نوعیت اور حیثیت سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے اور انگریزی الفاظ میں اس کو ایک Record کہا جا سکتا ہے اور یہ ریکارڈ اس وقت اور مستند ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسعود صاحب پہلی بار آج سے تقریباً بائیس سال قبل رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم کی تحریک پر جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس وقت سے اب تک متواتر اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ فرائض شناسی، دیانتداری، نیک نیتی اور حسنِ عمل سے اپنے عہدے کے وقار کے ساتھ جامعہ اُردو کی ترقی و توسیع کے لیے مصروفِ کار ہیں۔ اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ نہ صرف امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کا بلکہ معزز اراکین مجلس عام اور شرکائے کار و عہدیداران جامعہ کا بھی آپ کو بھرپور اعتماد حاصل ہے۔

امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کے علاوہ جامعہ کے اعزازی عہدیداروں میں امیر جامعہ پنڈت آنند نرائن ملا اور جناب مالک رام صاحب، نائب شیخ الجامعہ پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر مختار الدین احمد آرزو، خازن۔۔۔ پروفیسر عظیم الحق جنیدی، الحاج عبدالرحمٰن خاں صاحب شروانی اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رجسٹرار کی حیثیت سے راقم الحروف اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ مجھے شیخ الجامعہ کا اعتماد حاصل ہے اور یہی صورت جامعہ اُردو

کے دفتری عملہ کی ہے جس کی بنا پر ایک کھلے فکر و ذہن کے ساتھ جامعہ اُردو کی فلاح وبہبود کے لیے مسعود صاحب اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں۔ اور آپ کی سربراہی میں جامعہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے جامعہ کا معیار اور وقار بھی بڑھ رہا ہے طلبا ء وطالبات کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، تعلیمی امور پر بھی خصوصی توجہ کی جا رہی ہے، بدعنوانیوں میں ملوث امتحانی مراکز کی شکست کے باوجود ملک میں نئے مرکزوں کے قیام کے ساتھ مرکزوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ غیر ممالک میں بھی امتحانات کے مرکز کھلنے لگے ہیں۔ جامعہ کے بجٹ میں بھی گرانقدر اضافہ ہوا ہے اور دفتری امور بھی جامعہ کے قواعد وضوابط کی پابندی کے ساتھ انجام دیے جا رہے ہیں۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف پہلوؤں کے مدنظر جامعہ سے متعلق مسعود صاحب کی کارکردگی کا مختصر جائزہ لیا جائے تو ان میں سے چند پہلو حسب ذیل ہیں۔

جامعہ کے نظم ونسق کی اصلاح اور انتظامی امور

مسعود صاحب کو انتظامی صلاحیتیں قدرت سے ودیعت ہوئی ہیں۔ جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز ہونے سے قبل مختلف صورتوں میں ان صلاحیتوں کی جلا بھی ہوتی رہی اور تجربات کے ساتھ ان کو تقویت بھی ملتی رہی۔ صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، صدر شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی، قائم مقام سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند اور نائب صدر ترقی اُردو بورڈ دہلی کے علاوہ بالخصوص جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں شیخ الجامعہ پر فائز رہنے کے دوران مسعود صاحب کو انتظامی امور کا جو عملی تجربہ حاصل ہوا وہ جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کا چارج سنبھالنے کے بعد بہت کام آیا۔ اور چونکہ جامعہ سے وابستگی کے باعث آپ کی نظر میں جامعہ کے نشیب وفراز کی روشنی میں بہت سے اصلاحی امور پہلے سے موجود تھے اور ان کی فوری اصلاح پر آپ کی توجہ شروع سے رہی لہذا بہت جلد دفتری امور میں بہتری اور نظم ونسق میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ آپ نے دفتری عملہ کے ساتھ ہمدردانہ

اور مساویانہ رویہ اختیار کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا۔ اچھا کام کرنے والوں کی ستائش اور ہمت افزائی کی لیکن ساتھ ہی میں بدعنوانیاں کرنے والے فرائض ناشناس، نااہل اور خود سر ملازمین کو اولاً ہمدردانہ طور پر سمجھانے کی کوشش کی ان کو سدھرنے کا موقع دیا اس کے باوجود جب کسی نے اپنا غلط رویہ نہ چھوڑا تو ان کے ساتھ سختی سے بھی پیش آئے حتیٰ کہ ملازمت سے برطرف کرنے میں بھی گریز نہیں کیا۔ اس کے برعکس ترقی کے حقدار ملازمین کو ترقی بھی دی حسب ضرورت ملازمین کی پوسٹوں میں بھی اضافہ کیا اور خالی جگہوں پر باقاعدہ اشتہار اور انتخابی کمیٹی کے ذریعہ انٹرویو کے بعد بہتر سے بہتر آدمیوں کا تقرر کیا۔ ۱۹۷۳ء میں دفتری عملہ کی تعداد صرف ۱۵ تھی اور آج یہ تعداد بڑھ کر ۳۵ ہوگئی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ چونکہ مسعود صاحب کو جامعہ کے قواعد و ضوابط اور آئینی طریق کار کا پورا علم ہے اور اس کی پابندی کا احساس بھی ہے اس لیے ایسے موقع پر کمیٹیوں میں جب کوئی آئینی مسئلہ زیر بحث آیا تو مسعود صاحب کی معلومات نے اس کی عقدہ کشائی کی۔ چنانچہ عبید الرحمن خاں صاحب شروانی کے مستعفی ہونے کے بعد جب آنریری ٹریزرر کی تقرری کے سلسلہ میں مرزا خلیل احمد بیگ صاحب کا مسعود صاحب کی جانب سے نام پیش کرنے پر مجلس منتظمہ کے بعض اراکین نے اختلاف کیا اور غالباً کوئی دوسرا نام تجویز کیا تو مسعود صاحب نے جامعہ کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ اعزازی ٹریزرر کا نام پیش کرنے کا حق صرف شیخ الجامعہ کو حاصل ہے مجلس منتظمہ اس سے اختلاف کرسکتی ہے مگر ایسی صورت میں میری جانب سے دوبارہ وہی نام پیش ہوگا جو پیش کیا جاچکا ہے۔ بات اصول کی تھی لہٰذا مخالفت کرنے والے اراکین نے ان کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی اور بیگ صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

مسعود صاحب نے اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھا کہ ملازمین کو وقت پر تنخواہ ملے اور حسب قاعدہ ان کی تنخواہوں میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ ان کو دی جانے والی مراعات کے لیے بھی انہیں احتجاج نہ کرنا پڑے۔ چپراسیوں کو ان کی وردیاں ملیں اور ان امور کی بنا پر ملازمین میں بھی اعتماد پیدا ہوا۔ دفتری عملہ کی کارکردگی بھی بہتر ہوئی اور باقاعدگی کے ساتھ

وقت پر دفتر میں کام بھی ہونے لگا۔ اور نظم ونسق میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اسی سلسلے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ پیرانہ سالی کے باوجود مسعود صاحب پابندی کے ساتھ خود دفتر میں تشریف لاتے ہیں۔ دفتری امور پر پوری نظر رکھتے ہیں۔

جامعہ کے قواعد وضوابط کے مطابق جامعہ کے نظم ونسق سے متعلق مجلس عام کو اعلا اختیارات حاصل ہیں۔ جس کے صدر امیر جامعہ ہیں اس کے علاوہ مجلس منتظمہ، تعلیمی مجلس اور امتحانی کمیٹیاں قائم ہیں اور اس کے اعزازی عہدیداروں میں امیر جامعہ، نائب امیر جامعہ شیخ الجامعہ اور خازن کے انتخابات ہر چار سال میں ہوتے ہیں۔ ان میں شیخ الجامعہ کو منتظم اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعہ کے نظم ونسق، آئین وضوابط کی پابندی اور مختلف مجالس کے فیصلوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری شیخ الجامعہ کی ہوتی ہے۔ اور مسعود صاحب اپنی اس ذمہ داری کو جس حسن وخوبی سے نبھاتے چلے آرہے ہیں وہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کی شاہد ہے۔

مالیاتی امور اور جامعہ کا بجٹ

کسی بھی غیر سرکاری اور بالخصوص ایسے ادارے کا استحکام اور فروغ جس کی آمدنی کے وسائل محدود بلکہ غیر متعینہ ہوں آمد وخرچ کی پوری گرفت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ذرا سی لغزش بڑے مضر نتائج کا باعث بن جاتی ہے۔ ایسے اداروں کے خود کفیل ہوتے پر ہی ان کا ثبات رہتا ہے۔ یہی صورت حال جامعہ اُردو کی ہے جس کی آمدنی کا واحد وسیلہ طلبا سے وصول ہونے والی امتحانات کی فیس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور فیس کی رقم میں اضافہ یا کمی طلبا کی تعداد پر منحصر تھی۔ اگرچہ تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہنا یقینی سا تھا مگر اس میں کمی ہونے کا بھی احتمال رہتا تھا اور یہ خدشہ پیدا ہونے کے امکانات ایسی صورت میں نظر آنے لگے تھے جب امتحانات کے معیار کو اعلیٰ کرنے اور جامعہ کے وقار کو بڑھانے کی غرض سے مسعود صاحب نے بدعنوانیوں میں ملوث مراکز کو ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی وجہ سے طلبا کی تعداد میں کمی ہونا ایک ظاہر سی بات تھی۔ ادھر طلبہ کی تعداد کے گھٹنے کا خدشہ اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی مہنگائی کا خوف

جامعہ کے بجٹ کو متاثر کرسکتا تھا مگر شیخ الجامعہ کی سوجھ بوجھ اور مالیاتی امور پر ان کی مضبوط گرفت کے باعث جامعہ اُردو کبھی مالیاتی بحران کا شکار نہیں بنا بلکہ مالی اعتبار سے خودکفیل بن گیا۔ اور اس کے بجٹ اور آمد و خرچ میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔

اس کی بڑی وجہ مسعود صاحب کا طریق کار ہے۔ انھوں نے جامعہ کے سالانہ بجٹ کی مدات پر ہمیشہ نظر رکھی اور اس بات کا خیال کہ بجٹ کی مختلف مدات کی رقم ان کے متعینہ امور پر ہی خرچ ہو اور مقرر رقم سے زیادہ خرچ نہ ہو تاکہ بحران کی نوبت نہ آئے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے سالانہ بجٹ بنایا جاتا رہا اور اسی کے دائرہ میں اخراجات کیے جاتے رہے۔

جامعہ کو خودکفیل بنانے اور اس کی آمدنی بڑھانے کی غرض سے مسعود صاحب نے دوسرے وسائل بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں جامعہ کی زمین پر میڈیکل کالج روڈ کی جانب شاپنگ سینٹر کے طور پر دوکانوں کی تعمیر کا منصوبہ بھی بنایا۔ ان کے اس منصوبے کو مجلس منتظمہ اور مجلس عام کے معزز اراکین نے پسند نہیں کیا۔ غالباً اس خیال سے کہ ایک ایسے دفتر کی عمارت کے سامنے جس کا تعلق تعلیم سے ہو، دوکانوں کی تعمیر نہ صرف بازاری ماحول کا باعث بن جائے گی بلکہ دفتر کی عمارت کی اپنی شان و شوکت دوکانوں کے پیچھے دب کر رہ جائیگی۔ لیکن مسعود صاحب نے اپنے مضبوط دلائل کے ذریعہ ارباب حل و عقد کو ہموار کیا اور "اُردو بازار" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شاپنگ سینٹر کی دوکانیں تعمیر کرا کے جامعہ کی آمدنی میں گراں بہا اضافہ کیا۔ اور اس امر کا لحاظ رکھا کہ دوکانوں کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ جامعہ کے دفتر کی عمارت ان کے پیچھے چھپ کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ دوکانوں کا ایسا نقشہ تیار کیا گیا جس کے باعث جامعہ کی عمارت کے حفاظتی پہلو کو تقویت پہنچی، اور اس کا حسن بھی مجروح نہیں ہوا۔ دفتر پر بازاری ماحول بھی نہیں پڑا اور آمدنی میں اضافہ بھی ہو گیا۔

اگرچہ جامعہ اُردو کی آمدنی اور اخراجات کی نگرانی کا ذمہ دار اعزازی خازن ہوتا ہے وہی رجسٹرار کی مدد سے بجٹ تیار کرتا ہے جسے مجلس منتظمہ کی سفارش کے بعد مجلس عام منظور کرتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسعود صاحب کے گرانقدر مشوروں اور ان کی رہنمائی خازن کے

کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ مسعود صاحب نے دفتر کی عمارت اور نو تعمیر دوکانوں کے درمیان افتادہ زمین پر گھاس کے خوب صورت وسیع لان تیار کرائے اور چمن بندی پر توجہ کر کے عمارت کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ ۱۹۷۶ء میں جامعہ کے دفتر کی عمارت میں بھی اضافہ ہوا۔

مسعود صاحب نے جنوری ۱۹۷۳ء میں جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے منصب کا چارج سنبھالا تھا تو جامعہ کا سالانہ بجٹ ایک لاکھ باسٹھ ہزار روپے کا تھا اور آج یہ بجٹ بیالیس لاکھ اسی ہزار روپے کا ہے۔

تعلیمی، تدریسی اور امتحانی امور

جامعہ اُردو کا بنیادی کام تعلیمی، تدریسی اور امتحانی امور سے تعلق رکھتا ہے اس کی حیثیت ایک Examining University کی سی ہے۔ مسعود صاحب نے جامعہ اُردو کے اس بنیادی کام کی جانب پوری توجہ کرتے ہوئے بہت اصلاحی امور سرانجام دیے جن کے باعث نہ صرف جامعہ کی ساکھ مستحکم ہوئی بلکہ جامعہ کو فروغ بھی حاصل ہوا۔

(الف) امتحانات

جامعہ اُردو کے علاوہ اُردو کے امتحانات کے اور بھی بہت سے ادارے قائم ہوتے رہے اور ختم ہوتے رہے۔ لیکن مسعود صاحب کی طویل مدت کار کے دوران جامعہ اُردو نے جو وقار حاصل کیا اس کے باعث نہ صرف بہت سی یونیورسٹیوں نے اس کے امتحانات ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم اُردو کو تسلیم کیا بلکہ اُردو سے متعلق ملازمتوں کے سلسلہ میں مختلف ریاستی حکومتوں نے ان امتحانات کو منظور بھی کیا۔ اور مراعات بھی دیں۔ تعلیمی امور کی طرح امتحانی معاملات پر نظر رکھنے کی غرض سے "امتحان کمیٹی" بنائی گئی۔ جو امتحانات کے طریق کار کو بہتر بنانے اور ترتیب نتائج پر غور کرتی ہے۔ امتحانات کے پرچے بھی لیتھو کے بجائے آفسیٹ پر چھپوائے جانے لگے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ معلم اُردو کا نیا تدریسی

کورس مسعود صاحب کے زمانے میں ۱۹۷۹ء میں شروع ہوا تھا۔ اس طرح سرکاری ملازمین اور ایسے حضرات کے لیے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے ۱۹۸۶ء میں " اردو دانی" کورس شروع کیا گیا۔

(ب) امتحانات کے مراکز اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ

جامعہ اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث تمام ملک کے مختلف خطوں میں امتحانات کے مراکز کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے مقامات پر صحیح نگرانی کے فقدان میں بدعنوانیوں کی شکائیتیں بھی بڑھنے لگیں۔ مسعود صاحب نے اس پہلو کی اہمیت کے مدنظر امتحانات کے مراکز پر فرض شناس انسپکٹرس کو مامور کیا اور جس شکایت کو صحیح پایا وہاں کے مرکز کو ختم کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اور اس امر کو بھی مدنظر رکھا کہ کسی ایک ہی مقام پر مرکزوں کی تعداد زیادہ نہ ہو۔ اس کا اثر اخراجات پر بھی پڑتا ہے۔ اور انتظامات پر بھی لہٰذا ایسے مقامات پر بدعنوانیوں میں ملوث مراکز ختم کر کے مرکزوں کی تعداد کو کم کیا۔ اس حکمت عملی سے بظاہر طلبہ کی کی تعداد میں کمی ہونے کا خدشہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر مسعود صاحب نے جامعہ کے وقار اور اور اس کی ساکھ کو قائم رکھنے بلکہ بڑھانے کی غرض سے آمدنی میں کمی کی فکر نہیں کی بلکہ یہ نظریہ قائم کیا کہ جامعہ کے وقار اور امتحانات کے اعلیٰ معیار کی شہرت اور مقبولیت طلبہ کو اپنی طرف خود کھینچ لے گی اور ایسا ہی ہوا۔ جہاں ایک طرف ناکارہ مراکز بند ہونے لگے وہاں دوسری جانب نئے مرکزوں کے قیام کے لیے درخواستوں کی تعداد بڑھنے لگی لیکن جب تک کسی مرکز کے قیام کے سلسلے میں پوری طرح چھان بین کے ساتھ اس امر کی تصدیق نہیں کر لی گئی نئے سینٹر کے قیام کے لیے قواعد و ضوابط کی پابندی کے ساتھ ضروری امور کی تکمیل کر لی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی وہاں کوچنگ کی بھی سہولت فراہم ہے عمارت حسب ضرورت موجود ہے۔ اور اساتذہ کی خدمات بھی حاصل ہیں۔ ایسے مقامات کی درخواستوں کو قبول کیا جانے لگا۔ اور جہاں ان تمام امور کی تکمیل میں کمی نظر آئی وہاں سے موصول ہونے والی درخواستوں کو نامنظور کیا جانے لگا۔ اس کے باعث امتحانات کی کارکردگی اور بہتر ہوئی۔ مرکزوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اور نئے مقامات بھی امتحانات کے دائرہ

یں شامل ہوئے اسی کے ساتھ طلبا کی تعداد بھی بڑھتی رہی اور یہ خدشہ ختم ہو گیا۔ کہ قدیم مرکزوں کو توڑنے کی وجہ سے طلبا کی تعداد میں کمی ہو گی اور اس کا اثر جامعہ کی آمدنی پر پڑے گا۔ مگر مسعود صاحب کی دور اندیشی کے باعث مرکزوں کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔ طلبہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اور آمدنی بھی بڑھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔

سنہ	مرکزوں کی تعداد	طلبہ کی تعداد
۱۹۷۳ء	۲۸۳	۱۲۸۴۵
۱۹۹۴ء	۳۲۳	۳۱۰۰۰
۱۹۹۵ء	۴۰۰	۸۵۰۰۰

ان اعداد و شمار سے جامعہ اُردو کی ترقی اور اس کے امتحانات کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے پس پردہ مسعود صاحب کا حسن کارکردگی نظر آتا ہے۔

(ج) تعلیمی اصلاحات

جامعہ کے نصاب کو بہتر بنانے کی غرض سے مسعود صاحب نے جامعہ کے امتحانات کے نصاب پر خاص توجہ فرمائی۔ اس میں نئے مضامین شامل کیے گئے۔ نصابی کمیٹی نے معیار نصاب پر غور کیا اور ماہرین تعلیم سے نصابی انتخابات مرتب کرائے۔ اور ان نصابی کتب پر خود بھی نظر ثانی فرمائی۔ اسی کے ساتھ کتابوں کی بہترین اور دیدہ زیب طباعت کے مدنظر مروجہ لیتھو پریس کی طباعت کے بجائے آفسیٹ کے ذریعہ کتابوں کی طباعت کرائی۔ اس طرح نصاب کا معیار بھی بلند ہوا اور کتابوں کی طباعت بھی پہلے سے بہتر ہونے لگی۔ یہی نہیں بلکہ کتابوں کی قیمت کا بھی لحاظ رکھا گیا تاکہ عام طالب علم بھی کتابیں خرید کر ان سے استفادہ کر سکیں۔

(د) تدریسی امور

تدریسی امور کے تحت جہاں ایک طرف جامعہ کی عمارت میں تعلیمی مرکز کے نام سے ایک

کوچنگ سنیٹر قائم کیا گیا وہیں دوسری جانب امتحانات کے نئے مراکز کے قیام کے سلسلے میں بھی یہ شرط رکھی گئی کہ وہاں کوچنگ سنیٹر یا جامعہ کے نصاب کے تدریسی سہولت فراہم ہو۔ جامعہ کے کوچنگ سینٹر کے لیے تجربہ کار اساتذہ کا تعاون حاصل کیا گیا۔

سرسیّد بکڈپو

جامعہ کے امتحانات میں شریک ہونے والے امیدواروں کو نصابی کتب کی فراہمی کے لیے ۱۹۵۰ء میں ایک اشاعتی ادارہ سرسیّد بکڈپو کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا منیجر جامعہ کا رجسٹرار ہوتا ہے مگر اس کا عملہ اور بجٹ بھی علیحدہ ہوتا ہے بجٹ جو تقریباً دو لاکھ روپے سالانہ سے تجاوز کر چکا ہے۔ اس ادارے کے ذریعہ جامعہ کے نصاب کی کتابیں لیتھو پریس میں چھپوائی جاتی تھیں اب وہ آفیسٹ میں چھپنے لگی ہیں۔

علمی و تہذیبی سرگرمیاں ــــ جامعہ اردو کا بنیادی کام امتحانات کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے بھی اس کے زیر اہتمام علمی وادبی تقریبات بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ مسعود صاحب کے زمانے میں نہ صرف آگے بڑھا بلکہ اعلیٰ پیمانے پر اہم تقریبات کا انعقاد بھی کیا گیا۔ مثلاً مارچ ۱۹۷۴ء میں دہلی یونیورسٹی کے سرشنکر ہال میں امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا کی صدارت میں منعقدہ خصوصی جلسہ تقسیم اسناد میں آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی (سابق وزیر اعظم ہند) کو جامعہ اردو کی جانب سے "دکتور ادب" کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ایک خصوصی جلسہ میں رشید احمد صدیقی صاحب کو "دکتور ادب" کا اعزاز پیش کیا گیا۔ ۱۹۸۷ء میں ایک شاندار تقریب میں جامعہ اردو کے شاپنگ سینٹر "اردو بازار" کا افتتاح امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمایا۔

تاریخ جامعہ اُردو کی اشاعت ــــ ۲۳۰ صفحات پر مشتمل "تاریخ جامعہ اردو" کی اشاعت مسعود صاحب کے دور کا ایک اہم کارنامہ ہے جو جامعہ اردو کے جشن زریں کی یادگار کے طور پر پروفیسر

مسعود حسین خاں صاحب کی سربراہی میں یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز مرتب کی گئی تھی جس کے مطالعہ سے جامعہ کے قیام کے وقت سے کتاب کی اشاعت کے زمانے تک کی نہ صرف پوری تصویر سامنے آتی ہے بلکہ جامعہ کے آئین اور قواعد وضوابط کی معلومات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ کتاب تین ادوار پر منقسم ہے۔

قدیم دور ــــ (۱۹۳۹ء ــ ۱۹۴۸ء) تک مرتب ڈاکٹر مغیث الدین فریدی)

اس باب میں بزم اقبال آگرہ کے قیام اور جامعہ اردو آگرہ کی تشکیل کا ذکر کرتے ہوئے جامعہ اردو آگرہ کے قواعد وضوابط، امتحانات کے نصاب کی تفصیلات، عہدیداروں کے اسمائے گرامی، مجلس منتظمہ، اعزازی ممتحنین اور معاونین کی فہرست اور مرکزوں کے ناموں کے ساتھ امیدواروں کی تعداد وغیرہ کی معلومات سال وار فراہم کی گئی ہے۔

درمیانی دور ــــ (۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۳ء، مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی)

نئے آئین وضوابط، مجلس منتظمہ، مجلس عاملہ، تعلیمی مجلس، امتحان کمیٹی، سالانہ مالیاتی تفصیلات ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۳ء تک امتحانات میں شریک ہونے والے امیدواروں کی امتحان وار تعداد، امتحانات کے نصابات وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

جدید دور ــــ (۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۹ء مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ)

اس باب میں جامعہ کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ حسب ذیل حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(۱) عہدہ داران واراکین ــــ ہر انتخاب میں منتخبہ حضرات کی فہرست ان میں امیر جامعہ، نائب امیر جامعہ، شیخ الجامعہ، نائب شیخ الجامعہ، اعزازی خازن، مجلس عام، مجلس منتظمہ، تعلیمی مجلس اور امتحان کمیٹی کے اراکین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(۲) انتظامی امور ــــ رجسٹرار صاحبان کے نام، آئین وضوابط میں ترمیمات اور تغیرات وغیرہ کا ذکر ہے۔

(۳) تعلیمی امور ــــ طلبہ کی تعداد، مراکز کی تعداد، نئے کورسوں کا آغاز، رسالہ 'ادیب'،

کا احیا، وغیرہ کا ذکر ہے۔

(۴) مالیاتی امور ـــــ اس کے ذیل میں سالانہ آمد و خرچ کے حسابات، ذرائع آمدنی، رسالہ ادیب، سرسید بک ڈپو کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

(۵) علمی و تہذیبی سرگرمیاں ـــــ اس موضوع کے تحت جامعہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب جامعہ کی تاریخ کا ایک دلکش مرقع ہے جس کی کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔

مسعود صاحب کی بحیثیت شیخ الجامعہ، جامعہ اردو سے وابستگی کے پچھلے ۲۲ سال کے دوران اس کی ہمہ جہت ترقی و توسیع، اس کے وقار اور معیار کی بلندی، طلبہ اور امتحانات کے مراکز کی تعداد میں اضافہ، امتحانات میں باقاعدگی، قواعد و ضوابط کی پابندی، دفتری عملہ کی بہتر کارکردگی اور مالی اعتبار سے جامعہ کی خود کفالت اور ترقیات کے نئے منصوبے، جامعہ کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ موصوف آج بھی پیرانہ سالی کے باوجود ایک عزم جواں کے ساتھ جامعہ کی فلاح و بہبود اور ترقی و توسیع کے لیے میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اُن کی رہبری اور رہنمائی میں جامعہ کی خدمت کی سعادت حاصل ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ موصوف کی سرپرستی اسی طرح تا دیر قائم رہے۔ آمین

ایم۔ حبیب خاں

پروفیسر مسعود حسین خاں کی علمی خدمات

(اداروں کی روشنی میں)

پروفیسر مسعود حسین خاں ہمارے عہد کے ممتاز نقاد، محقق اور ماہر لسانیات ہیں۔ علمی دنیا میں ان کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے جن اداروں میں علمی خدمات انجام دیں ان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی، انجمن ترقی اردو (ہند) اور جامعہ اردو علی گڑھ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے، ۱۹۵۴ء میں ریڈر ہوئے اور ۶۲ء تک شعبۂ اردو سے متعلق رہے۔ اس عرصے میں علمی کام کرنے کے بہترین مواقع انھیں ملے۔ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" جیسی اہم تحقیقی کتاب لکھی۔ اردو زبان کی یہ تاریخ اتنی مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے دس اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جس طرح تاریخ ادب اردو میں حالی کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" اردو تنقید نگاری میں اہم تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح زبان اردو کی تاریخ میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو" کو فوقیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ان کی شاعری کا مجموعہ "دو نیم" پہلی بار منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ بڑا فکر انگیز ہے۔ اس میں نظموں اور غزلوں سے کہیں زیادہ پُر تاثیر ان کے گیت ہیں جس میں انھوں نے ایک خاص انداز میں ان کی تفہیم کی ہے۔ اس شعری مجموعے سے پہلے عظمت اللہ خاں کے 'سریلے بول' کو ہندی رسمِ خط میں مسعود صاحب نے تحریر کیا تھا۔ جسے ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں پروفیسر وصدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ یہاں بھی علمی ماحول ملا۔ دکنی ادب کی تدوین کی طرف توجہ کی اور فیروز بیدری کا "پرت نامہ" ۱۹۶۵ء میں مرتب کیا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد "پرت نامہ" پر مضمون لکھ کر متعارف کرا چکے تھے۔ یہ مضمون اردو ادب میں شائع ہوا تھا۔ "قصہ مہر افروز و دلبر" قدیم دکنی اُردو کی تدوین کی۔ دکنی اردو لغت کی ترتیب کا ڈول بھی یہیں ڈالا اور اس مشکل اور ادق کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ سب سے پہلے شمالی ہند کے مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد سے ۱۹۲۱ء میں انجمن کا سہ ماہی رسالہ "اردو" جاری کیا تو اس مجلّے نے دکنی ادب کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ مولوی صاحب نے تحقیق کے میدان میں بڑے معرکے کے کام انجام دیے یہاں تک کہ دکنی ادب کی بازیافت کا سہرا ان ہی کے سر رہا۔ مولوی عبدالحق کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں دوسرے شمالی ہند کے اہلِ قلم ہیں جنھوں نے دکنی ادب کی تدوین کو فروغ دیا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں قدیم اُردو، پرت نامہ اور بکٹ کہانی جیسے قدیم ادب پاروں کی تدوین کی۔ عبدل کے 'ابراہیم نامہ' کا مواد مسعود صاحب نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد اکٹھا کیا۔ اس سے ان کی ادبی بصیرت کا علم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ابراہیم نامہ کے مقدمے سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کو دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش بتایا ہے مجموعی طور پر مسعود صاحب پر حیدر آباد کے بعض افراد کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ سب سے زیادہ پروفیسر ہارون خاں شروانی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> " جامعہ عثمانیہ کی باقیات میں سب سے اہم شخصیت پروفیسر ہارون خاں شروانی کی تھی جن سے میری نسبتی عزیز داری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے جامعہ عثمانیہ مرحوم کی عظمت و جلال کا خیال آجاتا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود ان کا علمی انہماک پرانے اہلِ علم کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے ان کی سی منظم علمی زندگی گزارتے ہوئے بہت کم عالموں کو دیکھا ہے۔ جو کام ہاتھ میں لیتے اسے تکمیل تک پہنچاتے۔ میں اکثر ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا ......
> تاریخ کے علاوہ انھیں اردو زبان اور اس کے مسائل سے بھی گہری

دلچسپی تھی۔" (نذر مسعود ص ۱۹۰-۱۹۱)

چند سال بعد دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں پروفیسر و صدر ہوکر آ گئے، اس عرصے میں ۳۔ نومبر ۱۹۷۳ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور یہاں جامعہ میں ان کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ ان کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے جامعہ میں کوئی پروفیسر نہ تھا۔ اسے ڈیمڈ ٹو بی یونیورسٹی کہا جاتا تھا یعنی صرف یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تھا۔ مسعود صاحب نے اپنے عہد میں سب سے بڑا اور اہم کام یہ کیا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے منظوری حاصل کرکے اسے یونیورسٹی کرایا اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں باقاعدہ پروفیسر مقرر کیے۔ سب سے پہلا تقرر شعبۂ اردو میں دوسرا شعبۂ تاریخ میں کیا۔ شعبۂ اُردو کو فعال بنایا اور دوسری یونیورسٹیوں کے لیے اِسے مثالی بنایا۔

مسعود صاحب نے جامعہ میں جو خدمات انجام دیں وہ تقریباً سب صحیح تھیں اور ان میں ان کا خلوص شامل تھا۔ کچھ دن بعد مسعود صاحب جامعہ کی انتظامیہ سے بددل ہوکر علی گڑھ شعبۂ لسانیات میں اپنی سابقہ جگہ پر واپس چلے گئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد وزیٹنگ پروفیسر ہوکر سری نگر کشمیر چلے گئے جہاں اقبال انسٹی ٹیوٹ میں دوبارہ ان کا تقرر ہوا۔ یہاں انھیں اقبالیات کے غائر مطالعہ کا بہترین موقع ملا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اقبال کی "شعریات" پر کتاب لکھی اسی پر ساہتیہ اکیڈمی نے انعام سے نوازا تھا۔ اس طرح انھوں نے اقبال شناسی کے لئے نئے انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ انتخاب کلام اقبال، اقبال شناسی کا نقشِ ثانی ہے۔

مسعود صاحب کے علمی کام اردو زبان کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ 'ورودِ مسعود' اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں سے ایک ہے اس میں بالکل نئے ڈھنگ سے اپنی زندگی کے تجربات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شخصی خاکہ نگاری، سفرنامے کی جھلکیاں، پرانی تہذیب کی قدروں کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کی داستان بھی اسی میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق زندگی بھر درس و تدریس سے رہا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری تک جن لوگوں،

کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور پرکھا ان کے بارے میں بھی" وردِ مسعود" میں مرقع نگاری" کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ عبرت ناک منظر انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیکھنے کو ملا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) سے مسعود صاحب کی وابستگی قاضی عبد الغفار مرحوم کے زمانے میں قائم ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد قاضی صاحب انجمن کے پہلے سکریٹری تھے۔ ان ہی کے زمانے میں مسعود صاحب انجمن کی مجلس عام کے ۱۹۵۲ء میں ممبر منتخب ہوئے۔ تب سے انجمن سے ان کا رشتہ قائم ہے۔ وہ انجمن کے چند لائف ممبروں میں سے ایک ہیں۔ قاضی عبد الغفار کا انتقال ۱۶ر جنوری ۱۹۵۶ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ ان کی جگہ اعزازی جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے۔ سرور صاحب اکتوبر ۱۹۶۹ء میں چھ ماہ کے لیے ہندوستان سے باہر تشریف لے گئے ان کی جگہ قائم مقام سکریٹری پروفیسر مسعود حسین خاں بنائے گئے۔ اردو سے ان کو والہانہ عشق رہا ہے۔ اردو کی بقا، اس کے تحفّظ اور ترقی کے لیے ان کے دل میں جو جذبات ہیں۔ اس کا اندازہ "ہماری زبان" کے ان اداریوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے سکریٹری شپ (قائم مقام) کے زمانے میں تحریر کیے تھے۔ ان اداریوں کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مقالے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اردو تحریک کے لیے "ہماری زبان" اور دیگر رسالوں کے ذریعہ مسعود صاحب نے ٹھوس کام انجام دیے۔ انھوں نے ہماری زبان کے ذریعہ اردو تحریک کو عوام تک پہنچایا۔ اس کا اندازہ ہمیں ان کے ان اداریوں سے ہوتا ہے جن میں انھوں نے نہایت جرات اور بے باکی سے قلم اٹھایا ہے اور اردو کے موقف کی بھرپور نمایندگی کی ہے اور اردو زبان کی اہمیت کو اپنے اداریوں میں موثر طریقے سے واضح کیا ہے۔ مسعود صاحب کا، ہماری زبان میں جب اداریہ شائع ہوتا تو پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم خط کے ذریعہ ان کا حوصلہ بڑھاتے اور ان پر تبصرہ بھی کرتے۔

۸ر اپریل ۱۹۷۰ء کا اداریہ" اپنے عمل کا حساب" کے عنوان سے لکھا۔ انھوں نے لکھا کہ اردو کا صاحب اقتدار طبقہ بھی اردو کی صورتِ حال کا ذمہ دار ہے، پارلیمنٹ کے ممبران بھی۔ اردو والوں کو ڈاکٹر ذاکر حسین سے یہ شکایت تھی کہ ۲۲ لاکھ دستخطوں کا جو میمورنڈم لے کر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے پاس پہنچے تھے۔ جب خود صدر ہوئے

تو اُردو کو یکسر فراموش کر دیا لیکن مسعود صاحب حق بات کہنے میں ذرا بھی مصلحت سے کام نہیں لیتے وہ برملا حقیقت پسندی کا اظہار کر دیتے ہیں، وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"ہم کرسیٔ صدارت پر بھی فائز رہے، وہی کرسیٔ صدارت جس کے سامنے ایک بار داد خواہ بن کر گئے تھے لیکن اس پر جلوہ گر ہو کر ہم اردو کے حق کو یکسر بھول گئے۔"

ایسی بے باکی اور جرأت دوسروں میں مشکل سے ملے گی۔ مسعود صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر ان کو کسی کی بات یا تحریر اچھی لگتی ہے تو اس کی تعریف فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ وہ صحیح بات پر عمل کرتے ہیں اور آخر تک اس پر قائم رہتے ہیں۔ ان کے کردار کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ ٹوٹ سکتے ہیں دباؤ میں آکر جھک نہیں سکتے۔

مجھے سرور صاحب کے زمانے میں مسعود صاحب سے قربت کا شرف حاصل ہوا۔ یہ بات ستمبر ۱۹۶۹ء کی ہے۔ اس کے بعد ان سے میری دفتری اور غیر دفتری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک قائم ہے، اس طویل عرصے میں مجھے ان کو جتنا بھی جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا اور جو شفقت اور خلوص میں نے ان میں پایا وہ دوسروں میں بہت کم دیکھنے کو ملا۔ یہ خالص فرخ آبادی پٹھان ہیں۔ یہ جس کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں اس سے دوستی آخر تک نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خرابیوں کو خوبیاں سمجھ کر عزیز رکھتے ہیں۔ اگر کسی سے نفرت ہو جاتی ہے تو اس کا اظہار برملا کرتے ہیں اس کو چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کرتے۔ 'ورودِ مسعود' ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں بہت سی باتیں اپنے بارے میں ایسی لکھی ہیں جو دوسرا شخص جاننے کے باوجود نہیں لکھ سکتا۔ دوسروں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کا اپنا انداز ہے۔ سچائی کڑوی ہوتی ہے اس لیے جن دوستوں کو ان کی سچائی پسند نہ آئی وہ ان سے الگ ہو گئے۔ مسعود صاحب بھی انسان ہیں اور انسان غلطی کر سکتا ہے یا کسی کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وہ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں وہی دو ٹوک بات سچائی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ مصلحت نام کی کوئی چیز ان کے یہاں نہیں' کردار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

'بزم اقبال' آگرہ کے زیرِ اہتمام ۱۹۳۹ء میں جامعہ اردو کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت جامعہ اردو کے رجسٹرار طاہر فاروقی صاحب تھے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں آگرہ سے علی گڑھ، ظہیر الدین علوی صاحب لے آئے اور سب سے پہلے اس کا دفتر جانسن کے کارخانے کے ایک کمرے میں منتقل ہوا، اس کے بعد سلطان جہاں منزل کے بالائی حصے میں منتقل ہوا، بعد میں سر سیّد ہال کے اس کمرے میں جو شعبۂ اردو سے ملا ہوا تھا منتقل ہوا، علوی صاحب سب کام خود کرتے تھے، گھر پر بھی انھوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا، جو سر سیّد ہال کے ایک کمرے میں تھا، یہ دفتر ایک کلرک اور ایک چپراسی پر مشتمل تھا مسعود صاحب کا تعلق براہِ راست رشید صاحب کی تحریک پر ۱۹۷۳ء میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے قائم ہوا، اور آج تک اسی عہدے پر متمکن ہیں۔ جامعہ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ایسی ہی فعال شخصیت کی ضرورت تھی جو جامعہ کے وقار کو بلندی عطا کرے اور اسے آگے بڑھانے میں معاون ہو۔ مسعود صاحب میں انتظامی صلاحیت اور مالیات سے بخوبی واقفیت ہے اور جامعہ کو خود کفیل بنانے اور اس کی آمدنی بڑھانے کا ہمیشہ خیال رہا۔

۱۹۵۳ء میں طلبہ کی تدریسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے 'درس' کے نام سے ایک ماہنامہ جامعہ اردو نے جاری کیا۔ ۱۹۵۹ء میں اس کا نام 'درس' کے بجائے 'ادیب' کر دیا گیا، جو آج تک ہے۔ ۱۹۵۰ء میں سر سید بُک ڈپو قائم ہوا، شروع میں اس کا تعلق جامعہ سے بالکل نہیں تھا۔ بلکہ مسعود حسن صدیقی صاحب اور ظہیر الدین علوی صاحب نے مل کر اس اشاعتی ادارے کی شروعات کی تھی۔ البتہ جامعہ کے کورس کی کتابیں اس کی نگرانی میں طبع ہوتی تھیں اور اس کی آمدنی جامعہ سے الگ رہتی تھی، بعد میں مسعود صاحب کے زمانے میں اس کی آمدنی جامعہ اردو میں شامل کر دی گئی۔

آج کل مسعود صاحب جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر ہیں اور اس ادارے کی خدمت بڑی دیانت اور تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کی ترقی اور اس کو آگے بڑھانے کے امکانات پر ہمیشہ ان کی نظر رہتی ہے۔ چودہ۱۴ دکانیں تعمیر کرا کے اس کی آمدنی میں اضافہ کیا ہے اور اس مارکیٹ کا نام اُردو بازار رکھا ہے۔ یہ اُردو سے محبت کی ادنا مثال ہے۔ جامعہ اُردو کے امتحانات میں ہر سال طلبہ اور طالبات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سال ۸۰ ہزار سے اوپر طلبہ امتحانات میں شریک ہوئے۔ جامعہ اردو کے امتحان ادیب کامل

کے خصوصی مطالعے کے لیے غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام کے انتخابات مرتب کیے ہیں پہلی کتاب کا نام انتخابِ کلام غالبؔ اور دوسری کا انتخابِ کلام اقبالؔ ہے۔ غالب اور اقبالؔ شناسوں اور طلبہ کے لیے یہ بہترین تحفے ہیں۔

۲۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے اواخر میں دلّی میں جامعہ اردو علی گڑھ کا جشنِ زرّیں ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کی خواہش کے مطابق ایوانِ غالبؔ میں منعقد ہوا، وی۔ پی سنگھ اس وقت جنتا دل حکومت کے وزیرِ اعظم تھے۔ مفتی محمد سعید اور آئی۔ کے گجرال وزیر داخلہ اور وزیر امور خارجہ دونوں نے جشن زرّیں میں شرکت کی تھی۔ گجرال صاحب کو جامعہ اردو کی طرف سے ڈکتور ادب کی ڈگری دی گئی۔ اس جلسے کا انتظام زکریا صاحب اور مسعود صاحب کے ایما سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب (کنوینر جشن زرّیں) نے کیا تھا اور راقم انجم صاحب کا معاون تھا۔ یہ جلسہ جامعہ اردو کے کامیاب ترین جلسوں میں سے ایک تھا جس کی مقبولیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

ترقی اردو بورڈ کے وائس چیرمین رہے۔ بورڈ کی لسانیات کی اصطلاحات کمیٹی کے صدر بھی رہے اور اس کے تحت اصطلاحات سازی کا کام انجام دیا۔ اسی زمانے میں بورڈ کی ایک اسکیم کے تحت اُردو لغت کی ایک جلد کے ایڈیٹر مقرر ہوئے جس کی تدوین مکمل کر کے بورڈ کو دی۔ یہ جلد ابھی تک زیرِ طبع ہے۔

کتاب نما کا خصوصی شمارہ کتابی شکل میں راقم نے مرتب کیا۔ یہ پروفیسر مسعود حسین خاں (علمی، لسانی اور ادبی خدمات) کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۹۲ء میں مکتبہ جامعہ نئی دلّی سے شائع ہوا۔ یہ خصوصی شمارہ اردو دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ کتاب نما کے اب تک کے خاص نمبروں میں یہ واحد خصوصی نمبر ہے جو بہت جلد فروخت ہوا اور بالکل ختم ہو گیا۔ اب اس کا جدید ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد شائع ہونے والا ہے۔

مسعود صاحب اب ۷۹ برس کے ہو چکے ہیں جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کے ساتھ شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاحیات پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ یہ بڑا اعزاز بہت کم پروفیسروں کو ملا ہے۔

شمیم جہاں

مسعود حسین خاں ایک جامع شخصیت

اُردو دُنیا کی ایک قدآور اور نہایت محترم شخصیت کا نام مسعود حسین خاں ہے۔ جن کے علمی، ادبی اور لسانی کارناموں نے اُردو زبان وادب کی تاریخ میں اپنے ایسے ابدی نقوش ثبت کیے ہیں جو آج بھی زبان وادب کو سمجھنے میں ہماری راہ نمائی کر رہے ہیں اور مستقبل میں بھی ان کی افادیت مسلّم ہے۔

کسی بڑی شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یقیناً مشکل کام ہے۔ اور یہ اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، جب اس شخصیت کی علمی عظمت کا پاس بھی ہو اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی۔ لیکن مسعود صاحب ممتاز علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایک پسندیدہ شخصیت بھی ہیں۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ چند سطور میں، میں انھیں اپنا نذرانہ عقیدت پیش کروں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں سے غائبانہ تعارف یا تعلق تو ان کی تحریروں کے توسط سے تھا ہی۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں جب میں نے انجمن جوائن کی تو ان کی ذات خاص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مسعود صاحب سے میری پہلی مختصر سی ملاقات انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سالانہ جلسے اور اُردو گھر کی بلڈنگ کے افتتاح کے موقع پر ہوئی۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر خلیق انجم (جنرل سکریٹری) انجمن ترقی اُردو (ہند) کی انتھک محنت اور لگن سے جب اُردو گھر کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس کے افتتاح کا اہتمام بڑے شاندار پیمانے پر کیا گیا۔ چوں کہ اسی دوران انجمن کے سالانہ اجلاس بھی تھے اس لئے تمام اراکین انجمن اور دیگر معزز مہمان باہر سے تشریف لائے تھے۔ میرے

لیے انجمن میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں دنیائے علم وادب کی عظیم شخصیات کے ساتھ اس تقریب میں شریک تھی۔
لیکن چوں کہ ادبی حلقے میں اس وقت میں زیادہ متعارف نہیں تھی اس لیے کچھ اجنبیت سی محسوس کر رہی تھی
لیکن بحیثیت میزبان، میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے میں اور اسٹاف کے اور لوگ صدر دروازے
پر مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ میں نے دیکھا ایک صاحب گاڑی سے اتر کر اندر تشریف لا رہے
ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے "شکریہ" ادا کیا۔
پھر جلسے کے پروگرام کے متعلق چند منٹ گفت گو کی۔ ان کی باوقار شخصیت، مہذب انداز گفتگو نرم اور
شیریں آواز۔ میں ان کی منفرد سی شخصیت سے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی چوں کہ اس سے پہلے مجھے ان سے ملاقات
کا شرف حاصل نہیں تھا۔ اس لئے پہچان نہ سکی اور ان کے جانے کے بعد قریب کھڑے ہوئے ایک
صاحب سے ان کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ پروفیسر مسعود حسین خاں ہیں۔
ڈاکٹر صاحب اس وقت پچپن (۵۵) کے لگ بھگ ہوں گے۔ کھلا کھلا سا شگفتہ چہرہ
دل کش، پُروقار مسکراہٹ۔ گلاب سا سرخ سفید رنگ، کشادہ پیشانی، جس پر ان کی خوش بختی
کی لکیریں نمایاں تھیں، صاف شفاف آنکھیں، جن میں قدرت نے دل کشی اور ذہانت کوٹ کوٹ
کر بھری تھی۔ سر پر چھدرے بال، جن سے سفیدی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، چہرے کے ابھرتے ہوئے
نقوش خوب صورتی کی طرف مائل، چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا قد، تندرست بھرا بھرا جسم، سفید پاجامے
پر کالی گرم شیروانی میں ان کی سرخ وسفید رنگت اور بھی ابھر آئی تھی۔

مسعود صاحب کو دیکھ کر، ان سے مل کر خیال آتا ہے کہ شاید خالق مسعود صاحب پر قابل رشک
حد تک مہربان رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ڈاکٹر صاحب کو دنیا میں بھیجتے وقت
اپنے تمام خزانوں کے منہ کھول دیے تھے کہ بندے جو چاہو لے جاؤ، اور مسعود صاحب نے بھی دونوں ہاتھوں
سے اس کی مہربانیوں کو سمیٹ لیا۔

بقول شاعر : دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

اور یقیناً مسعود صاحب کو شکوہ کوتاہ داماں رہا ہوگا۔
ڈاکٹر صاحب کا جنم قایم گنج (یو۔پی) کے آفریدی پٹھان خاندان میں ہوا، جو ان کی خوش بختی کی پہلی

سیڑھی بھی کسی اعلیٰ یا ادنیٰ خاندان میں پیدا ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے لیکن اگر کوئی فرد کسی اعلیٰ خاندان میں جنم لیتا ہے تو یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک ایسے ہی تاریخ ساز اعلیٰ خاندان میں جنم لیا، جس کے بزرگوں نے نہ صرف شمشیر کے جوہر دکھائے تھے بلکہ شمشیرِ قلم سے بھی جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ قابلِ تحسین ہیں اور تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب میں اپنے بزرگوں کی تمام خصوصیات موجود ہیں لیکن اگر ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا جائے تو اپنے عادات واطوار، لب و لہجے کی شائستگی، امن پسندی، وسیع النظری، صبرو تحمل، ان کے مزاج کی نفاست و لطافت ان کی پٹھانیت کی نفی کرتی ہے۔ ان کی آواز میں پٹھانوں جیسی گھن گرج کی جگہ شائستگی، نرمی اور مٹھاس ہے۔ وہ دوستوں کے بھی دوست ہیں، دشمنوں سے بھی گلا نہیں۔ نہ دوستی میں وہ والہانہ پن، کہ ؎

ہوئے ہم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نہ دشمنی میں وہ شدت جو پٹھانوں کی خصوصیت ہے۔ ہاں ان کا بے باک اور بے لاگ رویہ، بے ریائی، دیانت داری، صاف گوئی، راست بازی اور خودداری ان کے اصلاً نسلاً پٹھان ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اور مشکل بھی، اس چند روزہ زندگی میں وہ تحصیل بھی کرے اور پایۂ کمال کو بھی پہنچے، ایسے کارنامے بھی انجام دے جنھیں بقائے دوام حاصل ہو اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں۔ ڈاکٹر صاحب انھی معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر کی ہے۔ اور ان کا بہت خوب استعمال کیا ہے۔ اپنے کیریر کے آغاز سے آج تک اپنی چھہتر سالہ زندگی میں انھوں نے جس طرح اپنے لہو کا پانی کر کے اُردو ادب میں گرانقدر اضافے کیے ہیں، شکر ہے کہ ان کے معاصرین، ناقدین اور قارئین نے بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ ان کی پذیرائی کی اور ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ڈاکٹر صاحب زندگی کے تقریباً ہر میدان میں کامیاب ترین انسان ہیں۔ انھوں نے عزت و شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ کامیابیوں و کامرانیوں سے ہمکنار ہوتے رہے ہیں۔ دنیائے علم وادب میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ نہ صرف ہند میں بلکہ بیرونِ ہند

میں بھی انھیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ علم و ادب کی دُنیا میں دور دور تک انھوں نے اپنے ایسے اَن مٹ نقوش ثبت کیے ہیں جو صدیوں تک قائم رہیں گے۔

دانش ورانِ ہند و پاک کی نظر میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا بحیثیت ایک عالم اور دانشور کا کیا درجہ ہے یہاں چند اقتباسات پیش کر رہی ہوں :

جناب مشفق خواجہ کراچی (پاکستان)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہمارے ان اہل قلم میں سے ہیں جن کے علمی کام اُردو زبان کا سرمایہ افتخار ہیں، ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ ہم نے ان کی کتابوں کے مطالعے سے خوف اور بے آرامی کے علاوہ علم بھی حاصل کیا، گو یہ علم اب تک ہماری کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہوا، لیکن یہ فخر کیا کم ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے خوانِ علم کے ریزہ چین ہیں۔

جناب قدرت نقوی کراچی (پاکستان)

اُردو کے مشہور محقق، ماہر لسانیات، صوتیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے ایک قدیم کتاب "عاشور نامہ" مرتب کر کے اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا :

پروفیسر مسعود حسین خاں اُردو کے ممتاز زبان داں ہیں انھوں نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ جامعہ اُردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) ہیں اور نہایت دیانتداری اور ایمانداری سے جامعہ اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ اُردو کو ایک فعال اور ایمان دار آدمی میسر ہے، انھوں نے جس لگن اور تندہی سے جامعہ اُردو کے کام کو آگے بڑھایا اور اس کی خدمت کی ہے اس کا اعتراف سب اُردو والوں کو ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

میرے استادِ محترم پروفیسر مسعود حسین خاں اُردو کے صفِ اوّل کے ادیب، نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں۔ اُردو کے مسائل پر انھوں نے جو اداریے لکھے تھے اور جو بعد

میں اُردو کے المیہ کے نام سے شائع ہوئے تھے وہ ہندوستان میں اُردو کی زبوں حالی،
اُردو کی تاریخ کا اہم حصّہ ہیں۔ اس موضوع پر ان کے تمام مضامین کے مجموعے کا ایک
ایک لفظ مستند ہے۔

پروفیسر گیان چند جین:

ایک مصنف کی حیثیت سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی شخصیت کثیر جہاتی ہے۔
ماہر لسانیات، محقق، نقاد اُردو تحریک کا فعال قلم کار، شاعر اور آپ بیتی نگار۔ تحقیق ان
کی ادبی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو ہے۔ پریم چند پر اُن کی یہ تحقیق معرکے کی ہے کہ اُردو
گئو دان" پریم چند کے انتقال کے بعد اُردو میں آیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین اُردو کے ممتاز
محققوں میں سے ہیں۔ تدوین کے میدان میں ان کے حریف کم ہیں۔ ان کی قدر شناسی میں
میں کسی سے پیچھے نہیں۔

جناب ابوالفیض سحر

پروفیسر مسعود حسین خاں کی لسانی اور علمی خدمات کی فہرست طویل بھی ہے
اور گرانقدر بھی۔ لیکن ان سب میں لغت نویسی کے علم کی دستارِ فضیلت جو ان کے سر پر
جگ مگا رہی ہے وہ یقیناً علم اور اقبال کی پر عظمت علامت بھی ہے۔ ان کے مغربی
ادبیات کے گہرے مطالعے اور لسانیات کے جدید سائنٹفک علم نے نئے چراغ
روشن کیے ہیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی:

پروفیسر مسعود حسین خاں اُردو علم و ادب کی ایک قد آور اور سر برآوردہ شخصیت
ہیں۔ گیتوں اور غزلوں سے لے کر تحقیق و تنقید، لسانیات، اسلوبیات، اقبالیات،
صوتیات اور سوانح تک ان کے علمی تبحر اور فنی سلیقے نے تاریخ زبان اُردو ادب میں
ہمیشہ زندہ رہنے والے کارنامے انجام دیے ہیں۔

جناب مغنی تبسم:

پروفیسر مسعود حسین خاں کے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کا دائرہ نہایت وسیع ہے

انھیں زیادہ شہرت ایک ماہر لسانیات اور اُردو زبان کے محقق کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ مقدمہ تاریخ زبان اُردو، ان کا وہ تحقیقی شاہکار ہے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے گا۔

سونیا چرنیکووا:

مسعود صاحب کی شخصیت مرے دل میں ان کی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی اہل علم ایسا نہ ہوگا جو مسعود صاحب کی علمی و ادبی حیثیت تسلیم نہ کرتا ہو۔ مسعود صاحب کی لسانیات پر لکھی کتابوں کی اصل قدر میں نے اپنے ملک میں جا کر جانی "شعر و زبان، اُردو زبان اور ادب، مقدمہ تاریخ زبان اُردو، وغیرہ۔ ان کو غور سے پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ لسانیات و ادب میں ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔"

بحیثیت استاد اور ماہر تعلیم ڈاکٹر صاحب کی خدمات یقیناً قابل تحسین ہیں یہ ان کا پیشہ بھی ہے اور شوق بھی، لیکن اس کے پیچھے قومی خدمت کا جو جذبہ کارفرما ہے، وہ انھیں آج تک اس کار نیک سے جوڑے ہوئے ہے۔

مسعود صاحب جامعہ اُردو علی گڑھ سے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ۱۹۷۳ء سے وابستہ ہیں۔ ۲۲ سال کے اس طویل عرصہ میں جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اس سے جامعہ اُردو کا نہ صرف وقار بلند ہوا ہے بلکہ اس کی کارکردگی میں ہر اعتبار سے نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ آج اس کی ترقی کے امکانات کافی روشن ہیں۔

جامعہ اُردو کا قیام ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا، اسے اس ادارے کی خوش نصیبی کہئے کہ اسے بابائے اُردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، سر تیج بہادر سپرو، کرنل بشیر حسین زیدی اور رشید احمد صدیقی جیسی علمی و ادبی شخصیات کی خدمات حاصل رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان مشاہیر کی سرپرستی سے جامعہ اُردو کو وقار اور توانائی حاصل ہوئی۔ لیکن اس ادارے کی بتدریج ترقی میں مسعود صاحب کی محنت لگن اور کوششوں کو خاص دخل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اپنی توجہ جامعہ اُردو کے کام کو آگے بڑھانے اور بہتر بنانے کی طرف مرکوز رکھی۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کے کونے کونے میں جامعہ اُردو کے مراکز قایم ہیں اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلبہ جامعہ اُردو کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں۔ درحقیقت جامعہ اُردو ان بچّوں کے لیے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے جنھیں حالات نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے۔

مسعود صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ انھوں نے اُردو ادب میں جو گرانقدر اضافے کیے ہیں اور ادب کے مختلف موضوعات پر جو مضبوط گرفت ان کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے اور جس کا اعتراف ان کے ہم عصر نقاد اور دانشوروں نے بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ماہر لسانیات بھی ہیں، نقاد اور محقق بھی، شاعر اور زبان داں بھی، لغت نگار، آپ بیتی نگار، مرقع نگار بھی ہیں اقبالیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ دکنی ادب کی بازیافت میں مسعود صاحب کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے وقت کی دبیز پرت کے نیچے دبے ہوئے دکنی ادب پاروں کو منظرِ عام پر لاکر ماضی اور حال کے درمیانی خلیج پر آہنی پل تعمیر کرنے کا کام انجام دیا ہے جس کے ذریعے ہم ماضی میں دور تک جھانک سکتے ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد ان قدیم ادبی شاہکاروں کا تعارف کرانا نہیں ہے جن کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر صاحب نے نہایت دیدہ ریزی سے کی ہے۔ بحیثیت محقق مسعود صاحب کا یہ کام نہایت وقیع ہے اور تاریخ ادب اُردو میں اہم اضافہ۔

اگرچہ بحیثیت شاعر مسعود صاحب زیادہ معروف نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہوگی کہ اپنے دیگر علمی و ادبی کاموں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری بے روح ہے ان کے قلم سے بہت خوب صورت اشعار نکلے ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ دار ہیں۔

ملاحظہ کیجیے یہ اشعار جن میں زندگی کی محرومیاں بھی ہیں اور مہربانیاں بھی۔

تجھے بہار ملی مجھ کو انتظار ملا
اس انتظار میں لیکن کسے قرار ملا
کسی کی آنکھوں میں تاروں کی مسکراہٹ ہے
کسی کی آنکھوں کو شبنم کا کاروبار ملا

حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ فکر نہایت وسیع ہے۔ اور زندگی سے بہت قریب۔
مسعود صاحب کا صرف ایک شعری مجموعہ "دو نیم" کے نام سے منظر عام پر آیا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں اور دوسرا اڈیشن ۱۹۸۶ء میں اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔

آپ بیتی ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا زیادہ تعلق آپ بیتی نگار کی ذات سے ہوتا ہے اور لکھنے والا جو واقعات بیان کر رہا ہے اس کو من وعن تسلیم کر لینے میں ہی عافیت ہے۔ کیونکہ یہاں آپ کا حق تنقید نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے اتفاق رائے سے آئین ادب یہی قرار پایا کہ وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔ لیکن "وردِ مسعود" پڑھ کر یہ بھرم ٹوٹ گیا۔ کیونکہ یہ آپ بیتی جو کہیں گے سچ کہیں گے سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گے کے مترادف ہے بعض حضرات کے لیے یہی اس کی خوبی ہے اور یہی خرابی۔ "وردِ مسعود" حقائق پر مبنی، ایک مثالی آپ بیتی ہے جس میں واقعات بے لاگ لپیٹ بیان کیے گئے ہیں۔
اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مسعود صاحب نے جہاں دوسروں کی نقاب کشائی کی ہے وہاں اپنی ذات کی پردہ پوشی بھی نہیں کی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں ان گنے چنے اہل قلم حضرات میں سے ہیں جنھیں اُردو ادب کی تقریباً ہر صنف پر دسترس حاصل ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ کوئی ایک مضمون ڈاکٹر صاحب کی تمام خوبیوں کو سمیٹنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اس کثیر جہاتی شخصیت کے گرانقدر خدمات کی اس پیمانے پر پذیرائی ہوئی ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں کئی انعام اور اعزازت سے نوازا گیا۔
ان کا علمی سفر آج بھی جاری ہے اور اُردو والوں کی ان سے بہت سی اُمیدیں ابھی بھی وابستہ ہیں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب کی پچھترویں جشن سالگرہ کے موقع پر میں انھیں دِلی مبارکباد پیش کرتی ہوں اور خدا سے ان کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔

اس مبارک موقع پر میں یہاں تشریف فرما قبلہ مسعود صاحب وائس چانسلر جامعہ اُردو پرو وائس چانسلر ڈاکٹر خلیق انجم اور جامعہ اُردو کے معزز اراکین سے گذارش کروں گی کہ جامعہ اُردو کا معیارِ تعلیم قطعی اطمینان بخش نہیں ہے اس میں اصلاح کی کافی گنجائش ہے

خلیق انجم

اُردو زبان کے مسائل پر مسعود حسین خاں کے مضامین

(ہماری زبان کے اداریوں کی روشنی میں)

پروفیسر مسعود حسین خاں کو اُردو والے ماہر لسانیات، نقاد، محقق اور ادیب، متنی نقاد اور ایک اعلا درجے کے استاد، اور شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن ان کی ایک اور حیثیت بھی ہے جس کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ دی ہے اور وہ یہ کہ مسعود صاحب اُردو زبان کے مسائل کے ماہر بھی ہیں۔ اُن کی اس صلاحیت کا اظہار اس مختصر سے زمانے میں ہوا جب وہ انجمن ترقی اُردو کے قائم مقام جنرل سکریٹری کی حیثیت سے "ہماری زبان" اور "اُردو ادب" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء سے یکم مئی ۱۹۷۰ء تک اور ۸ ستمبر ۱۹۷۲ء سے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک انجمن سے چھٹی پر رہے۔ انجمن کی مجلس عاملہ نے پروفیسر آل احمد سرور کی عدم موجودگی میں پروفیسر مسعود حسین خاں کو قائم مقام جنرل سکریٹری مقرر کر دیا۔ اس مدت میں مسعود صاحب نے "ہماری زبان" کے جو اداریے لکھے، وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔[1]

---

[1] اس مدت میں انھوں نے جو اداریے لکھے ہیں، انہیں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے "اُردو کا المیہ" کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ سے شائع کر دیا تھا اس کتاب میں وہ تمام اداریے شامل ہیں جو مسعود صاحب نے "ہماری زبان" کے لیے لکھے ہیں اور اس کے علاوہ مسعود صاحب نے "ہماری زبان" میں "میرا صفحہ" کے عنوان سے کچھ مضامین لکھے تھے، اس کتاب میں ان کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

میں نے اس مقالے میں یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء سے یکم مئی ۱۹۷۰ء تک کی مسعود صاحب کے لکھے ہوئے اداریوں کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے دو وجوہ ہیں ـــــ ایک تو پروفیسر مسعود حسین خاں ماہرِ لسانیات ہیں اور اُردو کے تمام لسانی پہلوؤں سے جس طرح وہ واقف ہیں، شاید اُردو میں کوئی اور نہ ہو ـــــ دوسرے اُردو سے غیر معمولی محبت ہونے کی وجہ سے مسعود صاحب ان تمام مشکلات سے بخوبی واقف ہیں جن کا اُردو کو پچھلے ساٹھ ستر سال سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے اُردو کے مسائل پر معرکتہ الآرا اداریے لکھے ہیں۔ ان اداریوں کی ایک ضمنی خوبی یہ بھی ہے کہ اُردو کے صفِ اوّل کے مزاح نگار و طنز نگار رشید احمد صدیقی مرحوم نے پروفیسر مسعود حسین خاں کے نام اپنے خطوں میں بیشتر اداریوں پر بڑے عالمانہ اور بصیرت افروز تبصرے کیے ہیں۔ میں اس مقالے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کے لکھے ہوئے ان اداریوں کا مختصر سا جائزہ لوں گا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے تبصروں کا بھی حوالہ دوں گا ـــــ

پروفیسر مسعود حسین خاں نے پہلا اداریہ یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کو "ہماری زبان" کے شمارے میں لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا "سنسکرت کی اصطلاحاتِ علمیہ اور اُردو زبان" ـــــ اگرچہ یہ اداریہ بہت مختصر ہے لیکن اس میں مسعود صاحب نے لسانیات سے اپنی واقفیت اور اُردو کے مسائل سے آگہی دونوں ہی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے دستورِ ہند کا حوالہ دیا ہے جس کی دفعہ ۳۵۱ میں کہا گیا ہے کہ

"ہندی کی لغت کے لیے بنیادی طور پر دوسری زبانوں سے الفاظ حاصل کیے جائیں۔"

پروفیسر مسعود حسین خاں نے ثابت کیا ہے کہ ہندی والوں نے موٹی موٹی اصطلاحوں کو اپنایا ہے۔ پھر ان اصطلاح سازوں کا اصرار ہے کہ ہندوستان کی باقی تمام زبانیں بھی ان ناقابلِ فہم اصطلاحوں کو اپنالیں۔ مسعود صاحب نے بہت سائنٹفک انداز میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر مختصر لیکن جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

۸ راکتوبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ "مہاتما گاندھی جی نے کیا سوچا تھا" ـــــ (زبان کے بارے میں) اس اداریے میں مسعود صاحب نے زبان کے بارے میں گاندھی جی کے نظریات پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ ایک ایسی زبان کے حق میں تھے جس میں ہندی اور اُردو دونوں شامل تھیں اور جسے

ہندوستانی کہنا مناسب تھا۔ یہ زبان گاندھی جی کے مشورے کے مطابق اُردو اور دیوناگری رسم الخط میں میں لکھی جانی چاہیے تھی۔ ہندوستان کے ہندی پریمیوں نے گاندھی جی کی زندگی میں ہی اس سلسلے میں اُن سے بغاوت کردی تھی اور خود کانگریس نے ہندوستانی کے خلاف اور ہندی کے حق میں تجویزیں پاس کیں، جن کا گاندھی جی کو بہت افسوس ہوا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں بہت سائنٹفک مزاج رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے اداریوں میں جذباتیت نہیں ہوتی۔ وہ بہت تُلی تُلی بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات کی بنیاد سائنٹفک نقطۂ نظر ہوتی ہے۔

۱۵ اکتوبر اور ۲۲ اکتوبر کا اداریے "یوپی میں اُردو" اور بہار میں اُردو کے موضوعات" پر ہیں ان دونوں اداریوں میں ۱۹۶۱ کی مردم شماری کی بنیاد پر یوپی اور بہار کے تمام اضلاع کی الگ الگ آبادی بتائی گئی ہے اور مشورہ دیا گیا ہے کہ کن کن اضلاع میں اُردو کے سلسلے میں کیا کیا کام اُردو والوں کو فوری طور پر کرنے چاہئیں۔ یکم نومبر کے اداریے کا عنوان ہے" اُردو کا سہ لسانی ماحول "۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے بڑے معقول انداز سے بتایا ہے کہ اُردو کا پہلا ماحول ہندی کا ہے۔ یوپی، بہار، ہریانہ، راجستھان، مدھیہ پردیش اور دہلی میں اُردو کو ہندی سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اُردو کا دوسرا ماحول آریائی زبان کا ہے۔ یعنی آسامی، بنگالی، اُڑیہ، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی ـــــ اُردو بقول مسعود صاحب" اُردو کا ایک اور لسانی ماحول ہے جو اُردو کے لیے سب سے زیادہ اجنبی ہے۔ یہ ماحول ہے جنوبی ہندوستان کی دراوڑی ریاستوں کا ـــــ جن میں تامل ناڈو، میسور اور آندھرا پردیش شامل ہے۔ اُردو ان مختلف حالات میں خود کو زندہ رکھنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔

۸ نومبر کا اداریہ ہے ـــــ" اُردو کی تہذیبی قدر اور ضرورت" ـــــ اس اداریے میں مسعود صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اُردو بولنے والوں کے لیے صرف ایک زبان ہی نہیں ہے، قدر بھی ہے اور ضرورت بھی ہے۔ اس زبان کی تشکیل میں رواداری، مفاہمت، لین دین کے تہذیبی اور ہندوستانی قومیت کے خدوخال شامل ہیں۔

۱۵ نومبر کے اداریے میں مسعود صاحب نے" اُردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم کے مسائل" پر بڑے

عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جب اُردو کو پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سکولوں سے بالکل ختم کر دیا گیا ہے ۔ تو پھر جو لوگ اُردو یونی ورسٹی کے قیام کا پُر زور مطالبہ کر رہے ہیں ـــــ وہ صرف خواب دیکھ رہے ہیں اور اگر بقول پروفیسر مسعود حسین خاں ـــــ یہ خواب پورا ہو گیا تو اس سے ہماری قوم کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے ۔ مسعود صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ

"علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، حیدر آباد یونیورسٹی، اُردو آرٹس کے کالجوں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی اپنی ریاستوں میں الحاقی یونیورسٹیوں کے فرائض انجام دیں یعنی اُردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کا الحاق ان یونیورسٹیوں سے ممکن ہو سکے۔"

۲۲ نومبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ "ہندی پرچار سبھا" پر ہے۔ جب گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن سے دست بردار ہو گئے تھے اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ سمیلن کے صدر اور پھر رکن کی حیثیت سے " ہندی اتھوا ہندوستانی " کے لیے جو پرچار کیا جاتا رہا وہ غلط تھا۔ اس کی تلافی کرنے کے لیے انھوں نے ہندی پرچار سبھا قائم کی۔ مسعود صاحب نے اس سبھا کے مقاصد کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کے " ہماری زبان " کا اداریہ " اُردو رسم الخط " کے موضوع پر ہے مسعود صاحب نے اُردو رسم الخط کی ضرورت اور اس کی خوبیوں اور طباعت میں اس کی خامیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اُردو کے رسم الخط کو بدلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اُردو زبان سے دستبردار ہو جائیں گے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کو یہ اداریہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء کے ایک خط میں مسعود صاحب کو اس اداریے کے بارے میں لکھا[1]

---

[1] رشید صاحب نے ان اداریوں پر مسعود صاحب کے نام ذاتی خطوط میں تبصرے کیے ہیں۔ پہلا تبصرہ ۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء کے خط میں کیا گیا ہے۔ اگر اس سے پہلے کے اداریوں پر تبصرے کیے گئے تو وہ خطوط " رقعاتِ رشید احمد صدیقی " میں شامل نہیں ہیں۔ (رقعاتِ رشید صدیقی، ص ۱۴۹)

"آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اُردو رسم خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلہ پر اس جامعیت و قابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گذرا پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب و لہجہ اپنے نزدیک یہ مضمون اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس سے آپ کی علمیت ہی نہیں شخصیت و شرافت کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ ایسی بے مثل خدمات کے لیے خدا آپ کو تادیر صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ آمین"

۸ ر دسمبر کے "ہماری زبان" کے اداریے کا عنوان ہے "اُردو ہے جس کا نام" ——— اس اداریے میں مسعود صاحب نے بتایا ہے کہ جب تک اُردو کا کوئی مرکز رہا۔ وہ محاورے اور روزمرہ کی پابند رہی اور اس کا ایک معیار قائم رہا۔ مرکزیت ختم ہونے پر زبان اپنے اصولوں سے منحرف ہوتی ہے۔ اس کے مختلف مقامات کے لکھنے والے کسی طرح کی پابندی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بقول پروفیسر مسعود حسین خاں ——— کم سے کم تین بار اُردو لامرکزیت کا شکار ہو چکی ہے اور ہر بار پھر اس کا ایک مرکز قائم ہو گیا۔ لیکن آزادی کے بعد جب اُردو لامرکزیت کا شکار ہوئی تو یہ زمانہ تھا جب اس کا محور قدموں کے نیچے سے نکلا جارہا تھا۔ اس اداریے کا ایک آخری فقرہ سوالیہ ہے وہ یہ ہے۔

"اُردو کی لامرکزیت کا یہ دور کب اور کہاں ختم ہوگا؟"

اس اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مسعود صاحب کے نام ایک خط میں ۱۱ ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو لکھا ———

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اُردو کی مرکزیت و لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کیے ہیں اُردو کے معرکہ آرا مسائل پر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایسے خوب صورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی بھی مضمون کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔

بار بار اس طرح کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے اور خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا بہرحال اولیٰ ہے۔ خدا مبارک کرے۔[1]"

۱۵ دسمبر کے "ہماری زبان" میں مسعود صاحب نے "گروگرنتھ صاحب اور اُردو" کے عنوان سے اداریہ لکھا ہے۔ یہ اداریہ صرف وہی شخص لکھ سکتا تھا جو ماہرِ لسانیات کے ساتھ ساتھ بہت کھلا اور صاف ذہن رکھتا ہو۔

یہ اداریہ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کو بہت پسند آیا۔ انھوں نے ۱۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کے خط میں اپنے خیالات کا قدرے تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں ـــــ

" مسعود صاحب مکرم تسلیم

ہماری زبان کی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں آپ نے اداریہ حسبِ معمول لکھا ہے۔ جب سے انجمن کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے "ہماری زبان" کے اداریے ہر اعتبار سے وقیع ہونے لگے ہیں۔ زیرِ بحث مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر عام طور سے اچھے اچھے لکھنے والے جذباتی سطح یا سطحی جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ کام کی بات کم کہتے یا کہہ پاتے ہیں۔ اس لیے ایسے مضامین کا اثر کم ہوتا ہے ان لوگوں پر بھی جو ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور زبانوں کی ابتدا، عروج اور زوال سے متعلق جتنے لسانی، قومی، تاریخی اور تہذیبی عوامل ہوتے ہیں ان پر بھی نظر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا اثر ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو اس زبان کے بولنے اور عزیز رکھنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ عناد رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر اداریے میں آپ نے پہلے ہی پیراگراف میں جتنی باتیں اسلام اور ہندومت کے اتصال سے جو فکری، لسانی اور مذہبی Currents and cross Currents نمودار ہوئے، جن کو شاعرانہ زبان میں کہیں گے کہ

---

[1] رقعاتِ رشید صدیقی، ص ۱۵۰۔

جورشتہ" موج وکنار پیدا ہوا یعنی" دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من"۔ پورا شعر
آپ کو معلوم ہوگا یہ ہے ؎

بامن آویزش او الفتِ موج است وکنار
دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من[1] "

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کا اداریہ" اُردو بنام ہندی" ــــ داستان ہے اُردو پر ہندی کے سیاسی غلبے کی ــــ مسعود صاحب نے ثابت کیا ہے کہ کس طرح فارسی ختم کی گئی ــ اُردو کو دیش نکالا دیا گیا۔ سنسکرت الفاظ کو ہندی میں کتنے بڑے پیمانے پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہندی اور اُردو کے سلسلے میں کانگریس کا کیا رول رہا ہے اور ہندی ریاستوں میں اُردو کے ساتھ حکومت کا کیا رویہ ہے ــــ اس اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ۵ر جنوری ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں پروفیسر مسعود حسین خاں کو جو کچھ لکھا، وہ نہ صرف اس اداریے پر تبصرہ ہے ــــ بلکہ" ہماری زبان" کے تمام اداریوں کی بھی غیر معمولی تعریف کی گئی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم لکھتے ہیں ــــ

" مسعود صاحب بکرم تسلیم

ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ پیش نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی، لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دل نشیں انداز میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے، اسے میں اظہار وابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں۔ اس اداریے میں پہلا اور آخری پیراگراف حسنِ بیان اور خاتمہ کلام میں بے مثل ہے۔ اعلیٰ انشا پردازی کا ایک بڑا مشکل اور نازک ہنر یہ ہے کہ مضمون شروع کیسے کیا جائے اور ختم کیوں کر ہو۔ اتفاق سے" ہماری زبان" کا ۲۲ نومبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کا عنوان ہے" ہندوستان پرچار سبھا" سبھا کی وکالت آپ نے کتنی اچھی کی ہے میرا مستقل خیال

---

[1] رقعات رشید صدیقی، ص ۱۵۱، ۱۵۲

یہ ہے کہ آپ کے اداریوں کا آخر میں انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ یہ طلبا، نیز ان لوگوں کے لیے بڑا مفید اور قیمتی مطالعہ ہوگا جو اُردو کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سے اُردو کی تائید اور وکالت کرنے والوں کا لب ولہجہ اور بات کہنے کی سطح اونچی ہو جائے گی جس کا اُردو کے حق میں بڑا اچھا اثر ہوگا۔ ان اداریوں سے ام۔ اے اُردو کے امتحانات کے لیے بڑے اچھے پرچے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح امتحانات کے پرچوں کا معیار بڑھ جائے گا۔

میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جب سے آپ نے "ہماری زبان" کی ادارت کا کام اپنے ذمہ لیا ہے آپ کی تحریریں اُردو سے متعلق اُمید وعزم کی وہ تازگی و تابناکی آگئی ہے جس کا میں ہمیشہ متمنی رہا اور آپ پس و پیش کرتے رہے۔ اکبر کا ایک شعر یاد رکھئے:

ہر چند بگولا مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے، اک وجد تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی

اسی رقص اور وجد کے طفیل "زندہ ہیں اقوام" اور یہی ہے" رازِ تب و تاب ملّتِ عربی"، ہم آپ ملّت عربی سے مستثنیٰ سہی![1]

پروفیسر مسعود حسین خاں نے "ہماری زبان" کی ادارت کے ابتدائی زمانے میں یو۔ پی اور بہار کے مختلف اضلاع میں اُردو بولنے والوں کا جو نقشہ دیا تھا ــــ ۸ جنوری ۱۹۷۰ء میں آندھرا پردیش میں اُردو کے عنوان سے آندھرا پردیش کے جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں، وہ لسانی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو کی پہلی قاتل یو۔پی کی حکومت ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ حکومت اُردو کے گلے پر چھری پھیرتی رہی اور اُردو والوں سے میٹھی میٹھی باتیں بھی کرتی رہی۔ یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتے میں یو۔پی حکومت کے تشکیل کردہ اُردو بورڈ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تھا، جس میں حکومت نے بتایا کہ اس نے اُردو زبان اور ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی اور حکومت سے ممکن نہیں ہیں۔

---

[1] رقعات رشید صدیقی، ص ۱۵۴، ۱۵۵

پروفیسر مسعود حسین خاں نے حکومت کے ان دعووں کا جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ یو. پی اُردو کی پہلی قاتل ہے۔

اس اداریے پر پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ۱۹ر جنوری ۱۹۷۰ء کے خط میں اپنے مخصوص، دلچسپ اور طنزیہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ بجائے خود ادب کا شاہکار ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں ——

"مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

اس دفعہ آپ نے اتر پردیش کے اُردو پر احسانات کی قلعی خوب کھولی۔ اس پر ایک واقعہ یاد آتا ہے ممکن ہے آپ نے سنا ہو۔ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے جون پور گرد و نواح میں آتش بازی کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ شہر سے متصل ایک پرانا بڑا اونچا قلعہ ہے فصیل سے ملا ہوا دریائے گومتی بہتا ہے۔ کرسمس کے زمانے میں صاحب کمشنر دورے پر آتے تھے۔ جون پور کے اکابر کی طرف سے قلعہ کی فصیل پر ضیافت کا انتظام ہوتا۔ حکام عالی شان وہاں سے دریا کے کنارے آتش بازی کا تماشا دیکھتے۔ آتش بازی ہی نہیں، حکام اسی اور دوسرے بہت سے ناگفتہ بہ شہر کے ایک فن کار تھے، جاڑے میں ننگ دھڑنگ مرض اور فاقے میں مبتلا آتش باز اپنی اپنی آتش بازی دکھاتے۔ حکام عالی مقام چیرز دیتے۔ فن کار صاحب سوٹ بوٹ سے لیس آگے بڑھ کر کورنش بجالاتے نتیجہ یہ ہوتا کہ نقد انعام اور سرٹیفکٹ تو یہ لے جاتے۔ آتش باز بے چارے ویسے ہی محروم گھر واپس آجاتے۔ اُردو مکاتب اور مدارس کو قائم کرانے اور چلانے والوں کا انجام اس رپورٹ سے یہی معلوم ہوا۔ خدا آپ کو آبرو سے رکھے اور تندرست کہ آپ نے اس پردے کو فاش کیا۔"[1]

۲۲ر جنوری کے شمارے کا اداریہ "میسور میں اُردو" —— کے عنوان پر ہے جس میں اعداد

---

[1] رقعات رشید صدیقی، ص ۱۵۶، ۱۵۷

شمار دیے گئے ہیں۔

یکم فروری کے اداریے میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے "۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اُردو" کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں مردم شماری ہوگی۔ اہلکار گھر پر آکر مختلف معلومات فراہم کریں گے۔ جس میں آپ کی مادری زبان لکھی ہوگی۔

مسعود صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مادری زبان اُردو لکھوانی چاہیے۔ کیوں کہ "جمہوریت اعداد و شمار کی بازی گری ہے۔ اگر اُردو والے اپنی مادری زبان اُردو لکھوانے سے تساہل یا گریز کریں گے تو کم سے کم اگلے دس سال تک ان کے قامت کی درازی اِن کہی اعداد و شمار سے ناپی جائے گی۔" حسب دستور پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے اس اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود صاحب کے نام ۴ فروری ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا۔

"ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمار و اعداد کے فن یا فنون کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے۔ کتنا بلیغ یہ جملہ ہے "جمہوریت اعداد و شمار کی بازی گری ہے" آپ کے اداریے پڑھتا ہوں تو آتش کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے ع

آتش لکھی یہ تو نے غزل عاشقانہ کیا

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جب تک مردم شماری ختم نہ ہو جائے۔ ہماری زبان کے ایک مستقل inset (اِن سٹ) میں زیر نظر اداریے کا آخری فقرہ درج ہوتا رہے جو شروع ہوتا ہے: "اگر اُردو والے ...... سے اور ختم ہوتا ہے اس پر ...... وہ قلم ہوگا۔"

یا اسی طرح یاددہانی کا کوئی پیغام یا تاکید۔

آخر میں یہ نوٹ بھی ہو کہ اُردو کو دوست رکھنے والے اخبار و رسائل سے درخواست ہے کہ وہ اس طرح کی یاددہانی اپنے اپنے صفحات میں تا اختتام مردم شماری مسلسل کرتے رہیں۔"[1]

---

[1] رقعات رشید صدیقی ص ۱۶۰۔ ۱۶۱

جنوری ۱۹۷۰ء میں بمبئی میں اُردو کا ایک کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن پر ہندی کے ایک ہفت وار اڈیٹر نے بڑی تلخ اور تند باتیں کہیں۔ ماہنامہ اُردو تحریک کے اڈیٹر (گوپال متل) نے اس ہندی اڈیٹر کی یاوہ گوئی کا معقول جواب دیا تھا۔ جب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے گوپال متل صاحب کی وہ تحریر پڑھی تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ پروفیسر مسعود حسین خاں بھی اس موضوع پر "ہماری زبان" کا اداریہ لکھیں۔ انھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۷۰ء کے ایک خط مسعود صاحب کو لکھا۔

مسعود صاحب مکرم تسلیم

تحریک (دہلی) میرے نام آیا کرتا ہے۔ گوپال متل اس کے ایڈیٹر ہیں۔ کمیونسٹ اور کمیونزم کے دیرینہ مخالف۔ اُردو کے حق وحمایت میں جو بات صحیح سمجھتے ہیں اس کو ہمدردی سے اور برملا کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے بھی خیر طلب رہتے ہیں، تحریک کا حالیہ شمارہ بھیجتا ہوں، اس میں بمبئی کے اُردو کنونشن سے متعلق ایڈیٹر کا نوٹ اور ہندی کے ایک اسکالر کا مضمون ہے دونوں کو ایک ایک نظر ملاحظہ فرما لیجیے۔ چاہتا ہوں کہ "ہماری زبان" میں آپ اس پر اپنے انداز کے دو تین اداریے لکھ دیں، جس سے مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔ —— اس سے اُردو سے الفت رکھنے والوں کو تقویت پہنچے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رہبری ملے گی۔ اس موضوع پر آپ سے بہتر لکھنے والا دوسرا نہیں، ایسے مضمون کی بڑی ضرورت ہے، اور ایسے ہی مضامین کی وقعت ہوگی۔ یوں بھی بمبئی کے اُردو کنونشن کا انجمن کو نوٹ لینا ضروری ہے۔

عجیب مصیبت ہے اُردو اور اردو سے متعلق ہر بات خواہ وہ علمی و تہذیبی ہو یا جان و مال اور آبرو سے متعلق، یتیم کا مال بن گئی ہے۔ ہر کس و ناکس جس طرح چاہتا ہے طبع آزمائی اور دست درازی کرتا رہتا ہے۔

اس وقت ملک کی ایک بڑی جماعت کو اس فکر میں مبتلا دیکھتا ہوں کہ کس طرح مسلمان نا مسلمان بنا دئے جائیں یا ناگفتہ بہ کر دے جائیں۔ جب سے کانگریس میں افتراق ہوا ہے مسلمانوں کے خلاف تشدد اور نفرت کی مہم اور تیز ہو گئی ہے۔ اس وقت مسلمان ہی ایسا عنصر ہیں جن کے خلاف تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف اور متضاد کیوں نہ ہوں متحد ہو جائیں گی۔ مہاسبھا، جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کا وجود اور اہمیت تمام تر اسی بنا پر ہے بہر حال یہ ایک غیر متعلق بات تھی، دراصل آپ سے درخواست کرنا ہے کہ "تحریک" کے متذکرہ مضمون کو سامنے رکھ کر یا اس کے حوالے سے چند اداریے ہماری زبان میں لکھ دیجئے ظاہر ہے آپ جو کچھ لکھیں گے وہ فرقہ وارانہ سیاسی اور صحافتی بالکل نہیں بلکہ تاریخی، تہذیبی، علمی اور واقعاتی ہوگا۔ آپ کے ان اداریوں کو اردو اخبارات بالضرور نقل کریں گے۔ صحیح صورت حال سامنے آئے گی اور سنجیدہ طریق کار کو لوگ اپنائیں گے۔ خدا کرے آپ اس کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔[1]

پروفیسر مسعود حسین خاں نے ۸ فروری ۱۹۷۰ء "ہماری زبان" کا اداریہ "دل اور دے ان کو ــــــ" کے عنوان سے لکھا جس میں ہندی ہفت روزہ اڈیٹر کے اعتراضات کا انتہائی معقول انداز میں جواب دیا۔ کنونشن میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بعض ریاستوں میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت دی جائے۔ ہندی ہفت روزہ کو اس تجویز میں سیاسی سازش نظر آئی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کچھ ریاستوں میں اردو کو یہ مرتبہ مل گیا تو اس سے فرقہ وارانہ اشتعال پیدا ہوگا بلکہ خود اردو کے حق میں اس قسم کی مانگ مضر ثابت ہوگی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اڈیٹر موصوف کی ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے بہت صحیح لکھا کہ:

سیاسی سازش لسانی اقلیتیں ہی نہیں اکثریتیں بھی کرتی ہیں۔ سازش اسے نہیں کہتے کہ اپنے حق کے لیے منت سماجت سے قائل کیا جائے۔

---

[1] رقعات رشید صدیقی ص ۱۵۸-۱۵۹

سازش اسے کہتے ہیں کہ کسی زبان کی کھال ادھیڑ کر اس کے ڈھانچے کو اپنانے کا ڈھونگ رچایا جائے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے اس کی فرمائش کی تھی کہ جب انھوں نے یہ اداریہ پڑھا تو انہیں محسوس ہوا۔

میں نے جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

انھوں نے پروفیسر مسعود حسین خاں کو ۱۱ فروری ۱۹۷۰ء کے خط میں لکھا ——

" مسعود صاحب مکرم تسلیم

کل "ہماری زبان" کا پرچہ وصول ہوا۔ اداریہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ چاہتا تھا اور جس کی بشارت آپ پہلے دے چکے تھے۔ آپ کا ذہن عنوان کی طرف کیسا منتقل ہوا اس کی داد نہیں دے سکتا۔ یہ مثل ہے بڑھاپے کی جہاں اور بہت سی بدتوفیقی ہے ایک اس کا جو خود غلط بھی ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ عنوان مجھے کیوں نہ سوجھا! خیر یہ ایک جملہ بطور اعتراف تھا۔ کہنا یہ تھا کہ اس ذہانت اور خوش مذاقی سے جس کا اظہار کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے میں اس بات کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبہ اور معیار کا ہے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ انجمن اور "ہماری زبان" کا جو چارج آپ کو ملا ہے اس میں اللہ کی کوئی بڑی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے۔ کتنا ہی گنہ گار رہا ہوں اللہ تعالیٰ کا مجھ پر جو فضل رہا ہے اس کے طفیل تھوڑے بہت یقین کے ساتھ خدا کے احسان کی دوسروں کو بشارت دے سکتا ہوں! اس لیے آپ کے لیے چاہتا ہوں کہ اس طرح کی "چتاونی" (معلوم نہیں اس لفظ کا یہ محل ہے بھی یا نہیں) برابر شائع ہوتی رہے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم نہیں کہاں کہاں سے Follow up

کیسے کیسے راستے نکلتے ہیں۔ ہر چہار طرف جو ذلت اور ظلم پھیلا ہوا ہے
اس کو کسی کو نہ غم ہے نہ شرم۔ بس ایک کار خیر رہ گیا ہے کہ اقلیت پر جس کا عملاً
اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے، عرصہ حیات تنگ سے تنگ ہوتا رہے۔
اور کتنی بڑی حماقت یہ ہے کہ اقلیت کہہ دینے سے مسلمانوں پر ظلم ہونا ثابت
نہیں ہوتا۔ آپ کے اداریے اب لکھنؤ کے موقر ہفت روزہ عزائم میں بھی
بھی شائع ہونے لگے ہیں۔"[1]

۱۵ فروری ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" کا اداریہ "انگریزی اور ہم" کے موضوع پر ہے۔ اس اداریے میں مسعود صاحب نے ہندوستان میں اُردو کی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ تامل ناڈ، بنگال اور ان دونوں ریاستوں کی دیکھا دیکھی پنجاب، آسام، اڑیسہ، اندھرا پردیش اور میسور جیسے مقامات پر انگریزی کی حمایت کرنے والے موجود ہیں مسعود صاحب نے بتایا ہے کہ ہندی والے انگریزی ہٹاؤ کی تحریک چلا رہے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ ہندی والوں سے تمام شک و شبہات کے باوجود اُردو والوں کو چاہیے کہ انگریزی کے خلاف تحریک میں حصہ لیں۔ مسعود صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آئندہ انگریزی کی جگہ مقامی یا ریاستی زبانیں لیں گی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسعود صاحب کے اداریوں کے سب سے بڑے مداح ہیں، لیکن جب انھیں مسعود صاحب کی رائے سے اختلاف ہوتا ہے تو اس کا بھی بلا تکلف اظہار کر دیتے ہیں۔ "انگریزی اور ہم" کے عنوان سے اداریے کے بارے میں رشید صاحب نے ۱۴ر فروری ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں لکھا:

"ہماری زبان کا حالیہ پرچہ نظر سے گذرا۔ انگریزی کے بارے میں
آپ نے جن خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے اختلاف نہیں، لیکن آپ کے اس
نظریے سے اتفاق کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ انگریزی کی جگہ مقامی
یا ریاستی زبانیں لیں گی۔ انگریزی کے بین ریاستی یا بین اقوامی زبان کی حیثیت
کو مقامی زبانیں کیسے اختیار کر سکیں گی؟ انگریزی کی میں یہاں وکالت نہیں
کر رہا ہوں بلکہ جو صورت حال ہے اس کا اظہار کرتا ہوں۔ انگریزی جاننے

---

[1] رقعات رشید صدیقی، ص ص ۱۶۲-۱۶۳

والوں کا پڑنا شمار و اعداد کے اعتبار سے کتنا ہی ناقابلِ اعتنا کیوں نہ ہو اس کا
جامع حیثیات ہونا اس کی اتنی بڑی صفت ہے جو اس کی ہندوستان اور
عالمگیر دونوں حیثیات کو تمام دوسری حیثیات پر بھاری کر دیتی ہے تعصب،
تنگ نظری اور خود غرضی سے قطع نظر، تہذیب اور علوم ہر اعتبار سے ہم کو حقیقت
پسندی کے جبر کا ہمت اور خلوص سے مقابلہ کرنا چاہیے اس پر کبھی پھر مفصل
بحث ہوگی۔" [۱]

۲۲ فروری کا "ہماری زبان" کا اداریہ ہے "مادری زبان"، اس اداریے میں مسعود صاحب نے
ان لوگوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو اپنے زبان کی برتری اور قومیت کی گیت گاتے
ہیں اور جن کا خیال ہے کہ قومی یک جہتی کے لیے یک لسانی ہونا ضروری ہے۔

یکم مارچ ۱۹۷۰ء کے اداریے کا عنوان ہے "پس پردہ" اس اداریے میں کلدیپ نایئر
کی کتاب Between the Line پر تبصرہ ہے۔ کلدیپ نایئر نے اس کتاب میں سرکاری
زبان کی پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندی اور اردو کے تنازعہ پر تفصیلی بحث کی ہے
مسعود صاحب نے انہی مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔

۸ مارچ ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں مسعود صاحب نے "اردو: علاقائی یا دوسری
سرکاری زبان" کے عنوان سے اداریے لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے دستورِ ہند میں
زبانوں سے متعلق دفعات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے دستورِ ہند کے مطابق علاقائی زبان
کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں! سرکاری زبان دستور کی اصل حقیقت اور جان ہے اسی لیے اردو
والوں کو علاقائی زبان کا نہیں بلکہ اردو بحیثیت سرکاری زبان کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اس
اداریے پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی مرحوم نے لکھا ہے کہ

"ہماری زبان ۸ مارچ کا اداریہ "اردو: علاقائی یا دوسری سرکاری زبان"
اس اعلیٰ پایے کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں۔ تنقیح، توضیح، زبان
اور زور، ہر اعتبار سے اتنے مختصر مضمون میں آپ نے جیسے Explosive
(آتشگیر) مسئلہ پر جس سنجیدگی اور بالغ نظری سے اظہار خیال کیا ہے، وہ ہر

---

[۱] رقعاتِ رشید صدیقی، ص ۱۶۴۔

شخص کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا شمار ان چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں، جو ہندوستان میں ان دنوں اُردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں۔

چاہتا ہوں کہ آپ کے اداریے یا ان کا خلاصہ ہندوستان کی بیشتر قابل لحاظ زبانوں (بشمول انگریزی) کے کالموں میں جگہ پاتے۔ یہ اداریے ان تحریروں اور تقریروں سے کہیں زیادہ مفید اور موثر ہیں جو عام طور پر اخبارات میں شائع اور پلیٹ فارم سے سُنی جایا کرتی ہیں، اس سلسلے میں اس تجویز پر بھی غور فرمایئے کہ آئندہ مردم شماری میں اُردو کو مادری زبان لکھانے پر ہم کو اصرار کرنا چاہیے اور کسی طرح کے خوف و خطر کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ اس کو ہماری زبان میں متواتر یا تھوڑے وقفوں سے شائع کرتے رہنا چاہیے اور کسی اخبار کے کسی صفحے میں بطور Inset اس کا اندراج ہو۔ عام نظروں کے سامنے یہ ہدایات مسلسل آتی رہیں گی تو اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا۔ کیا تعجب اس کی تقلید دوسرے اُردو اخبارات بھی کریں جو اُردو کے مسئلے پر ہمارے ہم نوا ہوں۔ Inset کی عبارت وقتاً فوقتاً بدلتی رہے تو اور اچھا ہوگا Inset پوسٹ کارڈ سائز کا ہو اور تحریر نسبتاً جلی اور پُرکشش وغیرہ۔

۱۵ رمارچ ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" کا اداریے کا عنوان ہے" ہماری نفسیات" مسعود صاحب نے اِس اداریے میں . . . . اُردو کی موجودہ حیثیت اور مستقبل کے بارے میں اُردو والوں کے مختلف رویوں کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کچھ لوگ اُردو کے مستقبل سے نا اُمید ہیں اور کچھ حضرات فلموں اور مشاعروں کا حوالہ دے کر اُردو کی مقبولیت کے گیت گاتے ہیں مسعود صاحب کا خیال ہے کہ حقیقت اِن دونوں رویّوں کے بین بین ہے انھوں نے بتایا ہے کہ سخت نامساعد حالات میں بھی اُردو کے مستقبل کے بارے میں اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔

" زبانوں کا عروج و زوال" عنوان ہے اس اداریے کا جو ۲۲ رمارچ ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان"

کے لیے لکھا گیا۔ اس اداریے میں مسعود صاحب نے مختلف واقعات و دلائل پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ۔

"ہندوستان میں اُردو زوال کی راہ پر بھرپور قدم رکھ چکی ہے۔ اس راہ سے بازگشت کے لیے زبردست اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے۔"

یہ اداریہ بھی پروفیسر رشید احمد صدیقی کو پسند آیا۔ انھوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں مسعود صاحب کو لکھا:

"مسعود صاحب مکرم۔ آداب

ہماری زبان کل ملا۔ اداریہ زبانوں کا عروج و زوال بہت اچھا ہے۔ ایسے اداریے ایک سے ایک اچھے آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس سے کتنوں کی ڈھارس بندھتی ہوگی اور میدان میں جمے رہنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ جیسا میں محسوس کرتا ہوں یقین کر لیا کیجیے کہ اچھے لوگ اسی طرح محسوس کرتے ہوں گے اس لیے کہ مجھ میں اس طرح کی مہارت تین چار پشتوں تک شریف اور ذی استعداد مسلمان نوجوانوں اور ادارہ کی اعلیٰ روایات میں بسر کرنے کے بعد پیدا ہوئی اس لیے اس کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہے۔"[۱]

۸ اپریل ۱۹۷۰ء کا اداریہ "اپنے عمل کا حساب" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس اداریے میں مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ اُردو کا صاحبِ اقتدار طبقہ بھی اُردو کی صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ اُردو والے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، لیکن انھوں نے کبھی اُردو کے لیے حکومت سے احتجاج نہیں کیا۔ اُردو والوں کو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے یہ شکایت تھی کہ وہ ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ میمورنڈم لے کر صدرِ جمہوریۂ ہند کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، لیکن جب ذاکر صاحب خود صدرِ جمہوریۂ ہند بنے تو وہ اُردو کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، مسعود صاحب کے سگے چچا تھے اور مسعود صاحب ان کا دل و جان سے احترام کرتے تھے لیکن اُردو کے معاملے میں انھوں نے

---

[۱] رقعات رشید صدیقی ص ۱۶۸

سگے چچا کو بھی نہیں بخشا۔ مسعود صاحب نے ذاکر صاحب کا نام تو نہیں لیا لیکن اشارۃً ذاکر صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"ہم کرسیٔ صدارت پر بھی فائز رہے، وہی کرسیٔ صدارت جس کے سامنے ایک بار داد خواہ بن کر گئے تھے۔ لیکن اس پر جلوہ گر ہو کر ہم اُردو کے حق کو یکسر بھول گئے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی ڈاکٹر ذاکر حسین کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ انھوں نے پندرہ ۱۵ ر اپریل کے ایک خط میں مسعود صاحب کو اُن کے اِس اعتراض کا بہت نرم اور شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ یہ جواب اُردو والوں کو مطمئن نہیں کر سکا۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا یہ خط خاصا طویل ہے اور اس موضوع پر اہم ترین تحریر ہے۔ اس لیے میں یہاں یہ پورا خط نقل کر رہا ہوں۔

"ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں جو اداریہ "........ اپنے عمل کا حساب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ پچھلے ۲۰-۲۲ سال میں اُردو دوستوں کی رفتار و روش کا بڑا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے۔ ذاکر صاحب سے متعلق مایوسی و ملامت کی ایک زیریں لیکن واضح لہر بھی ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور خود اپنی حیثیت سے جو کسی دوسری حیثیت سے کمتر نہ تھی اُردو وفد کی جو قیادت کی تھی وہ موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اور ضروری تھی، دوسری طرف انھوں نے گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے اُردو کے لیے جو کچھ نہیں کیا وہ بھی مصلحت اور منصب دونوں اعتبار سے درست تھا۔ آئینی گورنر، نائب صدر اور صدر وہی کر سکتا ہے کرے گا اور کرنا چاہیے جس کا متعلقہ کابینہ اس کو مشورہ دے۔ ایسے مسئلہ میں جیسا کہ اُردو کا تھا وہ اپنی ذاتی و انفرادی یا کسی اور حیثیت کو کام میں نہیں لا سکتے تھے، کوئی ایسا اقدام بہت بڑے خطرناک حد تک سیاسی Crisis کا موجب ہوتا اور صورتِ حال بد سے بدتر ہو جاتی، میرا خیال تو یہاں تک ہے کہ ایسا کرنے سے ملک کے سنجیدہ اور صلح پسند عناصر کو تقویت پہنچنے کے بجائے انتشار کو قبل،

غارت گری کا بہانہ مل جاتا۔ اس طرح اُردو کو نفع سے کہیں زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔
اُردو سے زیادہ مسلمانوں کے ناموس، جان اور مال کو، جیسا کہ آزادی ملنے کے بعد
سے اب تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ کچھ تعجب نہیں اُردو کو اس وقت جو تائید غیر مسلموں
سے مل رہی ہے وہ معدوم نہیں تو متزلزل ہو جاتی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں اقلیت
کے حق میں یہ بڑا المناک حادثہ ہوتا۔

مسلمانوں کی غلط اندیشی، غلط روی یا سہل انگاری کے بارے میں آپ نے
جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بظاہر بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن ہم آپ
اس صورت حال کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ جہاں تک اُردو کی حمایت یا اُردو
سے نامنصفی پر احتجاج کا تعلق ہے مسلمانوں کی پوزیشن یا Strategy جارحانہ
نہیں مدافعانہ ہے (منافقانہ یا نامنافقانہ بھی) مخالف قوتیں اقتدار، طاقت، تعداد
اور تاریخ غرض وہ تمام حربے جو ہماری زبان، مذہب، تہذیب اور معاشرت کو
مسخ یا معدوم کر دینے کے لیے بر سرِ کار لائے جا سکتے ہیں بڑی دھاندلی، بے باکی
اور سفاکی سے کام میں لائے جا رہے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد سے مسلمان کبھی اُردو کے اپنے ادارے (تعلیم گاہیں)
قائم کرنے کے لیے بھاگے پھرے ہیں اور کبھی ہندی کی طرف دوڑے ہیں کہ کہیں
ان کے بچے ہندی سے ناآشنا رہ کر ہندی کی دنیا میں پیچھے رہ کر پامال نہ ہو جائیں
ہندی سیکھنے کی طرف سے کچھ مطمئن ہوتے ہیں تو معاً اُردو کا خیال آتا ہے اور
بے اختیار دوڑے ہوئے واپس آتے ہیں کہ اس سنگلاخ زمین کو کہاں تک
کارآمد بنا سکیں۔ آپ سعیٔ صفا و مروہ کی روایت سے واقف ہوں گے جو ارکانِ
حج کا بڑا اہم رکن ہے۔ یعنی کس طرح حضرت اسماعیلؑ کی ولادت پر اُن کی ماں
حضرت ہاجرہ کی پانی کی تلاش میں بے اختیار بھاگتی ہوئی دور تک چلی جاتیں،
معاً حضرت اسماعیلؑ کی تنہائی، تشنگی اور تحفظ کا خیال آتا تو بے قرار و بے
اختیار ان کی خبرگیری کے لیے واپس آتیں اُردو کے تحفظ کی تنظیم اور ہندی کی

بالادستی کی تنظیم جن فریقوں کے ہاتھوں میں ہے ان سے آپ واقف ہیں۔ مسلمان انہی دونوں صفا و مروہ کے درمیان بھاگتے نہ پھریں تو کیا کریں! حضرت اسماعیلؑ کے ایڑی رگڑنے سے آب صافی کا چشمہ اُبل پڑا تھا دیکھئے اُردو کے پاؤں یا ناک رگڑنے سے کیا برآمد ہوتا ہے!

آزادی کے بعد سے اُردو والوں پر جو مصیبت اور ذمہ داری آئی ہے اس کا ہم سب کو احساس ہے اس لیے عام مسلمانوں کے جس رویہ کی آپ نے شکایت کی ہے وہ قابل معافی ہو یا نہیں سمجھ میں آتی ہے۔ اُردو کے چھوٹے بڑے ادارے قائم کرنے کے لیے جس طرح ہم کوشش کر رہے ہیں وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو بدلے ہوئے حالات اور "یا ندک حیلہ" مشتعل ہو جانے والی فضا کو دیکھتے ہوئے قابل لحاظ بھی نہیں ہے۔ جیسی مجبوریوں اور محرومیوں کا سامنا ہے وہ معمولی نہیں ہیں، ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا کہ جب تک اُردو میڈیم کی چھوٹی بڑی تعلیم گاہیں قائم نہ ہو جائیں مسلمان بچے بچیاں جہاں کی تہاں رہنے دی جائیں۔ اُردو کے لیے ساری سہولتیں فراہم کر دی جائیں۔ جب بھی مسلمان لڑکوں لڑکیوں کو ہندی نہیں علاقائی زبان میں بھی مہارت پیدا کرنی پڑے گی، سہ لسانی فارمولے میں اگر اُردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں نکلتی یا گنجائش نکلنے نہیں دی جاتی تو جن کی مادری زبان اُردو ہے ان کو اپنے بچوں کے لیے اُردو کی تعلیم کا بندوبست اپنے طور پر کرنا پڑے گی۔ یہ پوزیشن کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو، لازم مفر نہیں۔ قیمت چاہے جتنی دینی پڑے!

ابقول غالب ...... یہ عریضہ چھاپنے کے لیے نہیں ہے چھپانے کے لیے ہے)" [1]

۱۵ اپریل ۱۹۷۰ء کا "ہماری زبان" "اُردو نمبر" ہے۔ اس میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر نقشے

---

[1] رقعات رشید صدیقی، ص ص ۱۷۰-۱۷۲

کہ ہندوستان میں اُردو کی صورتِ حال اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد دی گئی ہے
آخر میں "۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اُردو" کے عنوان سے مقالہ لکھا گیا ہے، جس میں اُردو والوں کو
ہدایت دی گئی ہے کہ جب مردم شماری کے ہرکارے ان کے گھر آئیں تو وہ زبان کے خانے
میں احتیاط سے اُردو لکھوائیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ہماری زبان کے اس خاص نمبر
کے بارے میں مسعود صاحب کے نام ۱۵ر اپریل ۱۹۷۰ء کے خط میں ان الفاظ میں تعریف
کی :

"ہماری زبان کا اسپیشل نمبر تھوڑی دیر ہوئی ملا۔ واقعی ایسا ہی ہے بلکہ
اس سے بڑھا ہوا جتنا آپ نے بتایا تھا۔ آزادی کے بعد کی اُردو کا یہ کاغذی
پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا! خدا آپ کو اجر نیک
اور ہم سب کو آپ کے بتائے راستے پر چلنے کی عقل اور ہمت دے، بقیہ پھر
کبھی عرض کروں گا۔ انشاء اللہ۔"[1]

۲۲ر اپریل کے "ہماری زبان" کا اداریہ ہے "ایک ادارہ : ایک زبان" علی گڑھ یونیورسٹی
نے ۱۹۷۰ء میں انگریزی کے علاوہ اُردو اور ہندی میں بعض امتحانات کے پرچے لکھنے کی اجازت
دے دی تھی ۔ مسعود صاحب کا خیال ہے کہ اُردو کے ساتھ ہندی میں بھی جواب دینے کی اجازت
دے کر علی گڑھ نے اُردو کو اس کے حق سے محروم کردینے کا سامان مہیا کیا ہے۔ مسعود صاحب نے
اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو اُردو یونیورسٹی بنا دینا چاہیے تھا۔ رشید صاحب
نے مسعود صاحب کے نام ۱۸ر اپریل کے خط میں اِن مسائل پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے
اس سے پتا چلتا ہے کی اُردو کے مسائل پر رشید صاحب کی بڑی گہری نظر تھی ۔ انھوں نے اِس
اداریے پر خاصا طویل خط لکھا ہے۔ چوں کہ اس خط کی غیر معمولی اہمیت ہے اس لیے اِسے
پورا نقل کیا جارہا ہے ۔

"ہماری زبان میں" ایک ادارہ ایک زبان کے" کے عنوان سے ایک

---

[1] رقعاتِ رشید صدیقی ص۔ ۱۴۳

ادارہ پیشِ نظر ہے۔ علی گڑھ کا جو مسلک سرسیدؒ سے لے کر رہا ہے اس کے بارے میں آپ نے جس فاضلانہ اور فنکارانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اس کی داد غالب کی زبان میں اس شعر سے دی جا سکتی ہے جس سے انھوں نے اپنے کلام کی داد دی ہے ؎

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

علی گڑھ میں اُردو کے ساتھ جو سلوک اب تک وقتاً فوقتاً ہوتا رہا وہ مختلف محرکات و مقتضیات کی بنا پر ہوا۔ سرسیدؒ نے اُردو کی حمایت انہی محرکات کی بنا پر ابتدائے کار سے ورناکیولر یونیورسٹی کے منصوبے سے دست بردار ہونے تک کی۔ غدر کے بعد جو شکست و ریخت اور در و بست ہوئی اس میں مسلمان گھاٹے میں رہے، معیشت، تجارت، سیاست، تعلیم، تنظیم ہر اعتبار سے ابنائے وطن کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ درماندہ و پسماندہ اور ان سب پر مستزاد انگریز اور انگریزی حکومت کی نظر میں مقہور و مغضوب تھے۔ مسلمانوں کی آبادکاری کے لیے سرسید ہر سطح پر ہر جہت میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ جیسی تشویشناک ایمرجنسی میں انھوں نے مسلمانوں کو پایا تھا اس میں کسی اسکیم یا پروگرام کے ترک و قبول کا مسئلہ طویل میعادی نہیں ہوتا بلکہ بدلتے ہوئے حالات و حوادث کے پیشِ نظر جلد جلد بدلتا رہتا ہے۔ سرسیدؒ نے ورناکیولر یونیورسٹی کا مسئلہ تقاضائے وقت سے ترک کر دیا تھا اس لیے کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ فکر کو جلد سے جلد مسلمانوں میں مقبول بنانا چاہتے تھے۔ اُردو یونیورسٹی ان مصالح اور مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی تھی جن کا پورا کیا جانا لازم آتا تھا۔ تقدیر کے جس کن فیکون دوراہے پر سرسید کھڑے تھے اس میں انگریزی کو اُردو پر ترجیح دینے میں وہ یقیناً حق بجانب تھے، تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہ صورتِ حال آج تک قائم ہے۔ سوا اس کے کہ سرسید کے بعد

بھی علی گڑھ میں اُردو یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی یا اُردو کو وسیلہ تعلیم نہیں بنایا گیا اُردو کی ترقی میں علی گڑھ نے قابلِ فخر نہیں تو قابلِ اطمینان حد تک ضرور کوشش کی ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ علی گڑھ نے اُردو کے لیے جو کچھ کیا اس کو بہت آسانی کے ساتھ ان خدمات کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں جو حیدرآباد نے انجام دیں ـــــ اور حیدرآباد حکومتِ ہند کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی حکومت تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو اُردو یونیورسٹی بنانے میں جو موانع یا نقصانات تقسیم ملک سے پہلے تھے اس سے بدرجہا زیادہ اب ہیں اور آپ اندازہ کر سکتے ہوں گے۔ آزادی کے بعد اُردو کے ساتھ جو سلوک ہر سطح پر جس بے باکی اور بے رحمی سے مسلسل کیا گیا اور اب تک کیا جارہا ہے، اُن کے پیشِ نظر آج موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کیا حشر ہوتا اور کیسی تباہی آئی ہوتی اگر جامعہ عثمانیہ کی طرح اُردو یونیورسٹی ہوتی۔ آپ تو واقف ہیں ابنائے وطن مسلم یونیورسٹی کے مکمل اور معیاری یونیورسٹی ہونے کے باوجود یہی پروپگنڈا کرتے رہے کہ اس کا اسٹینڈرڈ گرا ہوا ہے!! جیسے فرسٹ کلاس انگریزی یونیورسٹی ہوتے ہوئے بھی مسلم یونیورسٹی "ورناکیولر" تھی، ہم میں سے کس کو خیال تھا کہ ملک تقسیم ہوگا اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ مسلمان اور ان کے ادارے کس مپرس اور کس مخز ہو جائیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جو ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام دھرتے اور پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ آزادی یوں ملے گی، ملک اس طرح تقسیم ہوگا، مسلمانوں کے ادارے، ان کی زبان، ان کے مذہبی و معاشرتی مسائل، ان کی جان، مال آبرو کا وہ حال ہوگا جو دیکھنے میں آرہا ہے، کس کو معلوم تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان اور جن چیزوں کو وہ عزیز رکھتے ہیں اس حالت کو پہنچ جائیں گے یا پہنچا دیئے جائیں گے جن میں وہ مبتلا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی اس وقت قائم ہی اس بنا پر ہے کہ وہ

ورنا کیولر یونیورسٹی نہیں تھی۔ اگر ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو صورتِ حال بالکل جداگانہ ہوتی ــــ یہاں تک کہ جو چیزیں آج خطرے میں نظر آتی ہیں وہ اس وقت سب سے زیادہ محفوظ، معتبر اور دانش مندانہ سمجھی جاتیں۔ رہا یہ کہ ہم سب وہ باتیں اب کیوں نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ لیکن اسی طرح جس طرح حضرت ہاجرہ کرتی تھیں جب وادی غیر ذی ذرع میں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی تھی ــــ آپ نے کالج کے ترانے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں ملامت اور استہزا کی جھلک آگئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ترانہ طلبا کا جوشِ دروں ہے اور نیک علامت ہے۔ معلم کو اپنے شاگردوں کے اس طرح کے خیالات سے بدگمان یا بدحظ نہ ہونا چاہیے۔

میری باتوں سے آزردہ نہ ہو جیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ موقع آئے گا تو آپ جاوبد سے اسی طرح کی باتیں کریں گے۔ اخبار تو کوئی لے گیا، مضمون کا صرف مبہم سا خیال رہ گیا ہے، ممکن ہے آپ نے کچھ کہا ہو میں نادانستگی میں کچھ کہہ گیا ہوں۔"[1]

پہلی مئی ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں مسعود صاحب نے "ہندوستانی ادب" کے عنوان سے اداریہ لکھا ہے۔ اس اداریے کا پس منظر یہ ہے کہ اس موضوع پر دس مئی ۱۹۷۰ء سے شملے کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں سمینار منعقد ہونے والا تھا۔ مسعود صاحب نے ہندوستانی ادب کی مختلف زبانوں کے ادب پر روشنی ڈال کر ادب میں اُردو زبان اور ادب کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ مئی کی ابتدائی تاریخوں میں سرور صاحب اپنے عہدے پر واپس آگئے اور پھر ۸ مئی سے انھوں نے ہماری زبان کے اداریے لکھنا شروع کر دیے۔

مسعود صاحب ایک بار پھر انجمن ترقی اُردو کے قائم مقام جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس دفعہ یہ مدت بہت کم تھی۔ یعنی ۸ ستمبر ۱۹۷۲ء سے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک ــــ یہ وہ زمانہ تھا

---

[1] رقعاتِ رشید صدیقی ص ص ۱۷۵ - ۱۷۷

جب "ہماری زبان" ہفت روزہ کے بجائے پندرہ روزہ ہوگیا تھا۔ اس لیے مسعود صاحب کو "ہماری زبان" کے چار اداریے لکھنے کا موقع ملا۔

پہلا اداریہ ۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے کا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "ہمارے مطالبات" مرکزی حکومت اعلا تعلیم کی درسی کتابیں تیار کرنے کے لیے ترقی اُردو بورڈ قائم کیا تھا اور اسے ایک کروڑ کی گرانٹ دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کئی زبانوں میں اُردو اکیڈمیاں قائم کی گئی تھیں ــــــ مسعود صاحب نے اس اداریے میں ان دونوں واقعات کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ:

> "ترقی اُردو بورڈ جو کتابیں تیار کرے گا اور خاص طور پر سائنس کی کتابیں ان کا استعمال کب اور کہاں ہوگا۔"

یہ سوال مسعود صاحب کا بالکل صحیح تھا۔ آج تیئس سال گزرنے کے باوجود یہ سوال بدستور قائم ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں ترقی اُردو بورڈ نے جو کتابیں تیار کی ہیں، وہ سب لائبریریوں کی زینت ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ کہیں بھی اعلا سطح پر اُردو کی ذریعۂ تعلیم کا انتظام نہیں ہے ــــــ مسعود صاحب نے اس اداریے میں مطالبہ کیا ہے کہ اس طرح کے اداروں پر رقم ضائع کرنا بیکار ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ یو۔پی، بہار، دہلی، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، میسور کی ریاستوں میں مخصوص مقاصد کے لیے اُردو کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

پہلا مقصد تو یہ ہے کہ اُردو کی ذریعۂ تعلیم کے اسکول قائم کیے جائیں۔ ان اسکولوں کے لیے اُردو کی درسی کتابیں تیار کی جائیں اور اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح کے کچھ اور مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو "ہماری زبان" کے اداریے میں مسعود صاحب نے یہ بتایا ہے کہ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں زبان کے مسائل حل ہوگیے ہیں تو وہ غلط فہمی میں ہیں۔ اکثریت یہ تو کر سکتی ہے کہ ہندی جیسے دستور ہند میں سرکاری زبان کہا گیا ہے۔ راشٹریہ بھاشا کر دے۔ لیکن اس سے دوسری زبانوں کے حقوق ختم نہیں ہوجاتے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں تین واضح، لسانی اور سیاسی حلقہ ہائے اثر ہیں۔ پہلا اور مرکزی حلقہ ہندی کا ہے جو پانچ ریاستوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان

ریاستوں کی آبادی ہندوستان کی کل آبادی کا ۳۰ فیصد ہے۔ پھر دوسرا حلقہ جنوبی ہند ہے جس میں چار دراوڑ ریاستیں ہیں: تامل ناڈو، آندھرا پردیش، میسور اور کیرالہ۔ مشرق میں بنگال، اڑیسہ اور آسام اور مغرب میں پنجاب اور کشمیر کی ریاستیں ہیں۔ تیسرا حلقہ وسطی ہے گجرات اور مہاراشٹر کی ریاستوں کا۔

اس اداریے میں مسعود صاحب نے بتایا ہے کہ لسانی نقشے میں ہندی اور غیر ہندوستانی ریاستوں کا رویہ اُردو کی جانب کیا ہے۔

۸ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کے اداریے کا عنوان ہے "بملاحظہ اُردو کمیٹی ـــــ مرکزی سرکار"

اُردو کمیٹی سے مراد گجرال کمیٹی ہے۔ مسعود صاحب نے اس اداریے میں کمیٹی کو مشورہ دیا ہے کہ جزوی مراعات سے کام نہیں چلے گا اور ترقی اُردو بورڈ اور اکیڈمیاں بنانے سے اُردو کا بھلا نہیں ہوگا۔ اس وقت اُردو کو ایک باقاعدہ نظام تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اُردو کی سرکاری اور قانونی حیثیت کا دستور ہند کی دفعات ۲۹، ۳۰ اور ۳۴۷ کے تحت تعین نہ ہو جائے۔

چوتھا اور آخری اداریہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کا ہے۔ اس میں مسعود صاحب نے انجمن کے نئے منتخب عہدے داران کا استقبال کیا ہے۔ یہ عہدے داران ہیں پنڈت آنند نرائن ملا (صدر)، ڈاکٹر یوسف حسین خاں (نائب صدر) اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (نائب صدر)۔ مسعود صاحب نے "ہماری زبان" میں "میرا صفحہ" کے مستقل عنوان کے تحت بھی کافی ادبی اور لسانی مسائل پر مضمون لکھے۔ ایم۔ حبیب خاں صاحب نے اپنے مقالے میں (جو اس کتاب میں شامل ہے) ان مضامین پر اظہار خیال کیا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے "ہماری زبان" کے جو اداریے لکھے ہیں، وہ مختصر لیکن بہت جامع ہیں۔ مسعود صاحب ماہر لسانیات ہیں۔ اس لیے وہ اُردو کے واحد ادیب ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدی میں اُردو کی موافق اور مخالف تمام تحریکوں سے بخوبی واقف ہیں اور اُردو کے مسائل کو پورے ہندستان کے لسانی تناظر میں دیکھنے کی بھرپور اہلیت رکھتے ہیں۔ ان اداریوں میں انھوں نے اُردو کو اس کے سماجی، تہذیبی اور لسانی پس منظر میں پیش کر کے اُردو مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جب ہندوستان میں اُردو کے مسائل کی تاریخ لکھی جائے گی تو یہ اداریے بہت اہم ماخذ ہوں گے۔

●●●

پروفیسر مسعود حسین خاں

غالبؔ کی حیاتِ معاشقہ

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتا اسدؔ
میری دِلّی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے! (قبل ۱۸۲۱ء)

غزل ایک داخلی صنفِ سُخن ہے جو ملبوس ہوتی ہے کنایات و ملائم کی تہ داری میں۔ اسی لیے اِس کی داخلیت سے کسی قسم کی خارجیت کا استخراج ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے میں خواجہ منظور حسین جیسے ادبیات کے دیدہ ور نے ایک عمر صرف کر دی[1]، اور چند غزل گو شعرا رمثلاً میرؔ، ظفرؔ، ذوقؔ، حالیؔ اور داغؔ کے کلام سے بعض "تاریخی حالات و معاملات" کا استخراج بھی کیا، لیکن غالب کے سلسلے میں اُنھیں بھی زیادہ کامیابی نہ ہو سکی[2]۔ وہ غالب کے تعلق سے اس "دورِ انحطاط" کے صرف چند نقوش عمومی بیانات کے طور پر فراہم کر سکے ہیں۔ اُن کے اِن بیانات میں بہر حال ایک تاریخی استحکام اور استدلال کی صورت ملتی ہے، یہ دیگر شارحین و ناقدین کے اُس روّیے کے بالکل مختلف ہے، جو غالب کے کلام کے تاریخی ارتقا اور اَدوار سے ناواقفیت کی بناء پر ایک دَور کا شعر دوسرے دور کے تاریخی حالات پر چسپاں کر دیتے ہیں؛ خاص طور پر جب ڈاکٹر سید محمود کی طرح غالبؔ کو ایک وطن پرست شاعر ثابت کرنا

---

[1] اردو غزل کا خارجی رُوپ بہرُوپ : لاہور، ۱۹۸۱ء
(اس تصنیف کے تانے بانے خواجہ منظور حسین نے تقسیمِ ملک سے قبل اپنے علی گڑھ کے قیام میں تیار کر لیے تھے)

[2] ۴۰۳ صفحات کی اس تصنیف میں وہ بہ مشکل چار صفحوں کا مواد فراہم کر سکے جو مشتمل ہے غالبؔ کے چند اشعار اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک قطعے پر۔ یہ تمام چیزیں بھی شعری نقطۂ نظر سے دوم درجے کی ہیں۔

[3] مقدمۂ دیوانِ غالبؔ

پیشِ نظر ہو۔

مولانا امتیاز علی عرشیؔ[1] اور کالی داس گپتا رضاؔ[2] کی کاوشوں سے اب غالبؔ کا اردو کلام بڑی حد تک تاریخی ترتیب پا چکا ہے۔ خاص طور پر غالبؔ صدی کے موقع پر (۱۹۶۹ء) گنجِ بادآورد کے طور پر ان کے ابتدائی کلام کے مجموعے "دیوان بخطِ غالبؔ" کے انکشاف کے بعد ان کے کلام کی تاریخی ترتیب میں بہت سہولت ہو گئی ہے جس سے اس "گنجینۂ معنی کے طلسم" شاعر کی شخصیت کے بہت سے پرت کھلنے لگے ہیں[3]۔

چوبیس پچیس برس کی عمر تک غالبؔ نے ایک "رِندِ شاہد باز" کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ تذکرۂ سرورؔ[4] کے مصنف نے، جو غالبؔ کے دوست تھے۔ اُنھیں ایک "دردمند" (عاشق) اور "پروردۂ عشقِ مجاز" شخصیت کا مالک بتایا ہے۔ خود غالبؔ اس دَور میں اپنے "فسق و فجور اور عیش و عشرت میں انہماک" اور "شورِ سودائے پری چہرگاں کا ذکر کرتے ہیں[5]"۔ دیوان بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) کے ایک شعر میں 'ایک" جفا مشرب" شیعہ محبوبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
مالِ سُنّی کو مُباح اور خونِ صوفی کو حلال

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) جس کی تکمیل کے وقت (۱۸۲۱ء) غالبؔ کی عمر ۲۴ سال کے قریب تھی، وہ بری طرح "عشرتِ صحبتِ خوباں" میں "اپنی عمرِ طبیعی" کی پروا نہ کرتے ہوئے منہمک تھے ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی (قبل ۱۸۲۱ء)

---

[1] دیوانِ غالبؔ : انجمن ترقی اردو (ہند)، طبع دوم

[2] دیوانِ غالبؔ (کامل) : بمبئی، ۱۹۸۸ء

[3] مذکورہ بالا 'بیشۂ شعر' کی سیاحت دشوار ثابت ہو تو دیکھیے، انتخابِ کلامِ غالبؔ (مکمل) مرتبہ مسعود حسین سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء

[4] یہ تذکرہ "عمدہ منتخبہ" ۱۸۰۰ء تا مرتب ہوتا رہا جس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے ہیں۔

[5] ذکرِ غالبؔ، مالک رام ص ۴۹ (طبع چہارم)

'شاہد بازی' ہیں یہ غالب کا عروج کا زمانہ تھا کہ وہ واقعۂ ہائلہ پیش آیا جس کی یاد انھیں عمر بھر ستاتی رہی۔ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں اپنے عزیز دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر اکبر آبادی کو ان کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جناب مرزا صاحب، آپ کا غم افزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا، یوسف علی خان کو پڑھوایا۔ انھوں نے جو میرے سامنے، اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشّاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھاوے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مَری۔ بھئی! مُغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مُغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں' مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھُٹ گیا۔ اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ سازیِ عشقِ مجازی چھوڑ دو ..."[۱]

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو یہ خط غالب نے ۱۸۶۰ء میں لکھا تھا[۲]، اس وقت غالب کی عمر ۶۳ برس کے قریب تھی۔ واقعہ کو غالب کی یادداشت کے مطابق چالیس بیالیس سال گزر چکے تھے۔ میرے

---

[۱] عودِ ہندی : ص ۱۶۵، نولکشور

[۲] دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) ص ۲۵۸ (فٹ نوٹ)

خیال میں "یہ چالیس بیالیس" سال سنہ ھجری کے ہوں گے، اس لیے کہ غالب سنہ عیسوی سے واقف ہونے کے باوجود اپنی عمر کا شمار ہمیشہ سنہ ھجری میں کرتے تھے۔ سنہ ھجری اور عیسوی میں ۳۶ سال کے اندر سال بھر کا تفاوت پڑجاتا ہے۔ یعنی سنہ ھجری، سنہ عیسوی سے سال بھر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے یہ واقعہ سنہ عیسوی میں ۱۸۱۸ء تا ۱۸۲۱ء کے درمیان کا ہوگا یہی زمانہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کی تصنیف کا ہے جس کی تکمیل ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی اور جس کے متن میں غالب کی ہائے ہائے! ردیف والی غزل کا اندراج ملتا ہے[لہ] اس طرح یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ اُسی "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کی المناک موت سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے، جسے غالب ۱۸۶۰ء تک نہیں بھولے تھے۔ اور مہر کی محبوبہ کے انتقال پر ان کی اپنی محبوبہ کی یاد کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے!

اب اس غزل کا متن ملاحظہ کیجیے جیسی کہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) میں درج ہے[لہ]

۱۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی، ظالم، تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

۲۔ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری، ہائے ہائے!

۳۔ کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری، ہائے ہائے!

لہ اس میں شبہ نہیں کہ مرثیہ نما اس غزل کا اندراج دیوان بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) میں ملتا ہے، لیکن وہاں یہ حاشیہ پر ہے اور کسی دوسرے کے قلم سے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل ۱۸۱۶ء کے بعد کہی گئی ہے اور اس نسخے میں جہاں اور چودہ غزلوں کا اندراج حواشی پر ملتا ہے، ان میں یہ بھی شامل ہے۔ (دیکھیے نسخۂ عرشی زادہ)

لہ کالی داس گپتا رضا نے دیوانِ غالب (کامل) میں اس غزل کو بعد از ۱۸۲۱ء کا بتایا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی جب کہ یہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے متن میں درج ہے اور بجز شعر نمبر ۱۳ (دوسرا مقطع) جس پر 'مطبوعہ' لکھا ہوا ہے غزل کے باقی اشعار پر 'قلمی' اندراج ہے جس سے نسخۂ بھوپال کا متن مقصود ہے۔

۴۔ عمر بھر کا تونے پیمانِ وفا باندھا تو کیا،
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہائے ہائے!

۵۔ زہر لگتی ہے، مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی، تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری، ہائے ہائے!

۶۔ گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا،
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!

۷۔ شرمِ رسوائی سے جا چھُپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر، پردہ داری، ہائے ہائے!

۸۔ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے!

۹۔ ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک، لگنے نہ پایا، زخمِ کاری، ہائے ہائے!

۱۰۔ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟
ہے، نظر، خو، کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے!

۱۱۔ گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایک دل، تِس پر، یہ نا اُمیدواری، ہائے ہائے!

۱۲۔ گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھالیتا اسدؔ
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے!

۱۳۔ عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے!

یہ غزل متداول دیوان میں بغیر کسی حک و اصلاح کے جوں کی توں برقرار رکھی گئی ہے، البتہ نمبر ۱۲ (مقطع اوّل) حذف کر کے نمبر ۱۳ (مقطع دوم) کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ عمل غالباً ۱۸۳۳ء میں متداول دیوان کا مُبیضہ تیار کرنے سے پہلے کر دیا گیا ہوگا۔ دوسرا مقطع (نمبر ۱۳) پہلے مقطع سے (نمبر ۱۲)

کہیں زیادہ پختہ اور عمومی صداقت کا حامل ہے۔ اس میں جذبے یا اظہار کی وہ ناپختگی نہیں ملتی جو مقطع اول (شعر ۱۲) سے ظاہر ہے۔ تخلص بھی اسدؔ کے بجائے غالبؔ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقطع (نمبر ۱۳) میں اس 'رسوائی' اور خواری کی واردات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس کی جائے وقوع دہلی کے کوچہ و بازار تھے۔ دوسرا مقطع پہلی بار نسخۂ رام پور قدیم میں درج ملتا ہے، جو بقول عرشی متداول دیوان کا پہلا نقش ہے۔

قبل اس کے کہ ہم غالبؔ کی عشقیہ واردات کا تجزیہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے فلسفۂ عشق کے بارے میں چند نکتے بیان کر دیں۔ اپنے دوست مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو ایک دوسرے خط میں (ان کا محبوبہ کی موت پر مسلسل جزع و فزع کرنے پر) یوں رقم طراز ہیں :۔

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی' آزادی کا شکر بجالاؤ، غم کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّا جان[۱] نہ سہی مُنّا جان سہی ...."

حسن و عشق میں انفرادیت پسند غالبؔ کے اس آزادانہ مسلک کے باوجود جس "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کو انھوں نے "مار رکھا" تھا اس کی یاد ساری عمر ان کی دامن گیر رہی، لہٰذا مذکورہ بالا غزل باریک بینی کے ساتھ تجزیہ چاہتی ہے۔ یہ ہی نہیں نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے دور کی اُن تمام غزلوں پر بھی نظر رکھنی ہوگی جن میں غالبؔ نے "دل کے داغ نمایاں" کیے ہیں۔

محولہ بالا غزل کے بارے میں سب سے پہلے نظم طباطبائی نے اپنی شرحِ دیوانِ غالبؔ (۱۹۰۰ء) میں یہ اشارہ کیا تھا کہ "یہ ساری غزل معشوق کا مرثیہ ہے"۔ اس کے بعد آغا محمد باقر نے اس کے اشعار کو

---

[۱] چُنّا جان عَلَم ہے مہرؔ کی محبوبہ کا نام تھا۔ اس کا انتقال ۳۱ مئی ۱۸۶۰ء کو ہوا تھا۔ (ذکرِ غالبؔ ص ۵۰)

'بکائیہ' لکھا ہے[1]۔ مالک رام نے ذکرِ غالب میں مزید تشریح کرتے ہوئے اس کے بارے میں یہ اظہارِ خیال کیا ہے۔

"چوں کہ یہ نظم 'نسخۂ حمیدیہ' کے متن میں شامل ہے، اس لیے یقیناً ۱۸۲۱ء کے پیشتر کا کلام ہے' جو اس نسخے کی تاریخ کتابت ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ اسی ستم پیشہ ڈومنی کا مرثیہ ہو"[2]

دوسرا اہم نکتہ جس کی جانب انھوں نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے:

"میرا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ 'ڈومنی' کوئی 'رنڈی' نہیں تھی۔ اس غزل میں ایک شعر (نمبر۷) یہ ہے ؎

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری' ہائے ہائے!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بازاری عورت نہیں تھی، ورنہ کہاں کی "شرمِ رسوائی" اور کہاں کی "پردہ داریٔ اُلفت"۔ اس شعر سے یہ بھی گماں گزرتا ہے کہ شاید اس نے خودکشی کرلی تھی"۔[3]

مرزا حاتم علی مہر کو غالب کا ۱۸۶۰ء کا مکتوب، اس میں چالیس بیالیس سال پہلے کی ایک وارداتِ عشق کی جانب اشارہ "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کی ترکیب سے محبوبہ کی شناخت دلّی میں 'رسوائی' اور 'خواری' کا خوف اور بالآخر محبوبہ کا "شرمِ رسوائی" سے نقابِ خاک میں جا چھپنا، ایسی کڑیاں ہیں جس سے غالب کے عشقیہ ڈرامے کے سارے باب مرتب ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلے "ڈومنی" کے بارے میں صراحت کر دینا ضروری ہے' پہلی بات تو یہ ہے کہ "ڈومنی" اس عہد کے سماج میں (اور بعد تک بھی) ایک (Socialite) کی حیثیت رکھتی تھی، کسبی نہیں ہوتی تھی۔ میرے قصبے، قائم گنج (ضلع فرخ آباد) میں، میرے بچپن تک ڈومنیوں کا گھریلو تقریبات میں آکر گانا بجانا عام تھا۔ یہ لوگ 'ڈوم' کے بجائے خود کو 'سرودی' کہلائے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ بھی پٹھان ہیں۔ جن کے آبا و اجداد قائم گنج کے دیگر آفریدی پٹھانوں کی طرح صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے قائم گنج آئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی ذات میں

---

[1] بیانِ غالب : لاہور ۱۹۴۹ء (طبع چہارم)
[2] مالک رام : ذکرِ غالب ص ۵۰
[3] " " ص ۵۱

کوئی کھوٹ نہیں تھا، البتہ پیشے کے اعتبار سے وہ گاتے بجاتے تھے۔ اور یہی ان کی معاش کا وسیلہ تھا۔ بیگماتِ اودھ کی مصاحبت میں جو ڈومنیاں رہتی تھیں وہ عام ڈومنیوں سے خود کو اعلیٰ و برتر سمجھتی تھیں۔ بہرحال ان کا کسبی نہ ہونا مسلّم ہے۔ اس کا امکان ضرور تھا کہ بڑے گھرانوں میں جہاں وہ گانے بجانے جاتی تھیں۔ وہاں کا کوئی من چلا رئیس زادہ کسی طرحدار ڈومنی سے تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ امکان اس وقت بڑھ جاتا تھا جب رئیس زادہ (غالب کی طرح) شاعر ہو اور ڈومنی خواندہ و سخن فہم ہو۔ دونوں کے درمیان یہ کاروبارِ عشق نہایت خفیہ اور بڑوں کی نظر سے بچا کر ہوتا تھا۔ اس لیے کہ 'رسوائی' کا خوف دونوں طرف ہوتا۔ لیکن عشق اور مُشک دونوں کب چھپتے ہیں، بھانپنے والے بھانپ جاتے۔ بالکل یہی صورت غالب کے اس معاشقے کی ہوئی۔

یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ غالب، امراؤ بیگم کے رشتے سے خاندانِ لوہارو کے داماد بن چکے تھے۔ ان کے خسر الٰہی بخش معروفؔ جو نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے، ایک عرصے تک عیش و نشاط کی زندگی گزارنے کے بعد تائب ہو کر صوفیہ کے حلقے میں داخل ہو چکے تھے۔ غالب کی شادی کو تقریباً ۶، ۷ سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ کئی بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے، ایسے میں اچانک اس تازہ واردات کا پیش آنا ان کے اور ان کی محبوبہ دونوں کے لیے باعث خواری و رسوائی تھا۔ اس لیے ان کی دِلی خواہش تھی کہ یہ واقعہ غربت میں دلّی سے پرے کہیں ہوا ہوتا ؎

گر مصیبت تھی، تو غُربت میں اُٹھا لیتا اسدؔ
میری دِلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے!

غالب ہزار 'بادہ خوار' سہی لیکن ثقاتِ لوہارو کی لاج رکھنا ان کے لیے بھی ضروری تھا۔ جمیل الدین عالیؔ نے اپنے خاندان کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ غالب اپنی مذموم حرکتوں کی وجہ سے لوہارو خاندان میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ خود غالب بھی "ستم ہائے عزیزاں" کے شاکی تھے۔ دہلی سے بے زاری کا ذکر انھوں نے اس دور کے ایک اور شعر میں بھی کیا ہے:

دہلی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت
بے چارہ چند روز کا یہاں مہمان ہے (قبل ۱۸۲۱ء)

غالب اپنی تعقّل پسندی کے سبب جان کو عزیز جانتے ہوئے اس واقعۂ سخت کی تاب لے آئے۔

لیکن وہ "ستم پیشہ" خود اپنا شکار ہو گئی۔ غزل کا آغاز اس کی جاں کنی کے عالم سے ہوتا ہے، اس عالم میں بھی وہ شکوہ کناں ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری، ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم، تری غفلت شعاری، ہائے ہائے!

شکوے کی یہ لے بلند ہوتی جاتی ہے جب وہ تیسرے اور چوتھے شعر میں اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ اگر تیرے دل میں "آشوبِ غم" کا حوصلہ نہ تھا تو پھر تو نے میری "غم گساری" کا دم کیوں بھرا تھا۔ تیرے عمر بھر کے "پیمانِ وفا" باندھنے سے کیا فائدہ؛ تو میری حالتِ زار کو دیکھ کر عمر کو بھی پائداری نہیں ہے۔

چوتھے شعر تک عالمِ نزع میں محبوبہ کی زبان سے شکوہ کیا گیا ہے۔ بعد کے شعروں میں اُس کی اَلم ناک موت پر شاعر نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ پوری غزل ایک ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ محبوبہ کی آواز کون سی اور شاعر نے اپنی آواز کہاں سے شامل کر دی ہے۔ جیسا کہ ۶، ۷ اور ۸ ویں شعر سے ظاہر ہے، محبوبہ نے 'شرمِ رسوائی' کے خوف سے 'نقابِ خاک' میں جا چھپنا پسند کیا۔ یعنی خود کشی کر لی۔ شاعر کو اب زندگی زہر لگنے لگی۔ اس لیے کہ وہ وفا کی کسوٹی پر پورا نہیں اترا۔ وہ گل اندام جو اپنے نازِ جلوہ سے گل افشانی کرتی تھی، آج خاک پر اپنی لالہ کاری دکھا رہی ہے اور یہ سب اس نے "شرمِ رسوائی" اور بدنامی کے خوف کی بنا پر کیا ہے۔ محبوبہ کی موت شاعر کے لئے سارے جہاں کی موت ہے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا سے 'راہ و رسمِ یاری' جیسے اُٹھ گئی ہو۔

غالبؔ کی عشقیہ واردات کا یہ دور زیادہ طویل نہیں تھا۔ (میرے خیال میں برس دو برس: اسی لیے انھوں نے ۱۸۶۰ء میں اسے چالیس بیالیس برس کا واقعہ بتایا ہے) یوں ہے کہ غالبؔ کہتے ہیں کہ ابھی 'عشق کا زخمِ کاری' دل پر لگنے بھی نہیں پایا تھا کہ یہ ڈراما محبوبہ کی خود کشی پر اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ اب روتی برسات کی تاریک رات ہے اور وہ ہیں۔ ہجر میں جو وقت وہ "اختر شماری" کے سہارے کاٹتے تھے، اس کا بھی موقع نہیں۔ نہ تو گوش تک محبوبہ کی گلبانگِ تسلّی" پہنچتی ہے۔ اور نہ چشم اس کے "جلوۂ ناز" کی گل افشانی دیکھ پاتی ہیں۔ شہرِ دہلی اب انھیں کاٹنے لگا ہے۔ اور وہ 'غربت' کے متلاشی ہیں۔ نئے مقطع میں بھی انھیں احساس ہے کہ عشق نے ابھی جنون کی کیفیت اختیار نہیں کی تھی کہ بساطِ محبت اُلٹ گئی ؎

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
دل میں جو کچھ رہ گیا تھا ذوقِ خواری ہائے ہائے!

ہر چند غالبؔ نے اپنے عشق کی نوعیت "مصری کی مکھی" کی بتائی ہے اور غالباً اُن کے دیگر معرکہائے عشق اسی نوعیت کے ہوں گے، لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" سے جسے انھوں نے "مار رکھا" تھا، دل لگی کو ہم صرف دل لگی کہہ کر نہیں ٹال سکے۔ اس لیے اس دور کی ان تمام غزلوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جہاں جہاں اس کا عکس ملتا ہے۔ محولہ بالا غزل میں واردات کے اثبات کے بعد باقی کام قیاس کے لیے رہ جاتا ہے۔

اس دور کی ایک اور غزل جس میں یادِ ماضی کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے، المیہ کے ایک سال بعد کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ یہ غزل نسخہ بھوپال (حمیدیہ) کے حاشیے پر درج ملتی ہے[۱]

وہ فراق اور وہ وصال کہاں	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے	ذوقِ نظّارۂ جمال، کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا	شورِ سودائے خطّ و خال، کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے	اب وہ رعنائیٔ خیال، کہاں (بعد ۱۸۲۱ء)

"اک شخص" اب غالبؔ کی شاعری کا استعارہ سا بن گیا ہے۔ واردات سے زمانی قُرب کے پیشِ نظر یہ "اک شخص" وہی "ستم پیشہ" تو نہیں جس کو چالیس بیالیس سال بعد بھی یاد کر کے چیخ اُٹھتے ہیں "اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

غالبؔ دو سال کے معاملاتِ عشق و محبت میں سبھی نشیب و فراز سے گزر گئے: شوقِ وصل، غمِ ہجراں، چھیڑ چھاڑ، حتّٰی کہ دھول دھپّا تک۔

دِل دیا جان کے، کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا (قبل ۱۸۲۱ء)

فلک کو دیکھ کے، کیوں اس کو وفادار اسدؔ
جفا میں اس کی ہے، اندازِ کار فرما کا (قبل ۱۸۲۱ء)

معاملاتِ حسن و عشق میں غالبؔ عام طور پر مغلوب نظر آتے ہیں۔ ان کا محبوب ہر زمانے میں

'ستم پیشہ' اور 'جفا مشرب' رہا اس لیے اللہ کا یہ شیر (اسداللہ) کوچۂ عشق میں جا کر سگِ لیلیٰ بن جاتا ہے ؎

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جئے خوبانِ دل آزار کے پاس (قبل ۱۸۲۱ء)

اپنی بے بسی پر کبھی کبھی جھنجھلاہٹ آتی ہے تو یہ ردِ عمل ہوتا ہے ؎

ہے ہے، خدانخواستہ! وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے؟ (قبل ۱۸۲۱ء)

لیکن غالبؔ کے لیے ترکِ محبت ناممکن ہے۔ یہ ان کی زندگی ہے۔ بالآخر پھر محبوبہ کے قدموں پر آجاتے ہیں ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ — اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ — گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی (بعد ۱۸۲۱ء)[۱]

معاملاتِ حسن و عشق میں کامرانی اور ناکامی کے نشیب و فراز آتے ہیں خاص طور پر جب محبوبہ 'ستم پیشہ' اور 'جفا مشرب' ہو۔ کاروبارِ محبت کی یہ دھوپ چھاؤں ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔ ؎

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ — بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے[۲]

---

[۱] نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے حاشیہ پر (نوٹ: نسخۂ بھوپال کے ناپید ہو جانے کی صورت میں یہ بتانا کہ حواشی میں درج غزلوں کی نوعیت کیا تھی، ذرا مشکل ہے۔ اس لیے ایسی تمام غزلوں کو "بعد از ۱۸۲۱ء" تصور کرنے کا تحقیقی جواز نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ کچھ غزلیں حاشیے پر نہیں بلکہ آخر میں چسپاں زائد اوراق میں درج تھیں)

[۲] یہ غزل نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے آخر میں اضافہ شدہ اوراق میں درج تھی۔

لیکن غالبؔ کی 'صورت' ایسی تو نہ تھی کہ 'خوب رویوں' کو نا خوب معلوم ہو۔ مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو اپنے جوانی کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں :

" بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ..." [1]

غالبؔ کی عشقیہ واردات میں رشک و رقابت ایک خاص جذبہ ہے، جو محبوبہ سے منسوب ہر دور میں پایا جاتا ہے۔ اس "ستم پیشہ" کو وہ کیوں کر بخش سکتے تھے :

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؛ (قبل ۱۸۲۱ء)

گو تم کو رضا جوئی اغیار ہے لیکن
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے (قبل ۱۸۲۱ء)

'ستم گر' 'ستم پیشہ' محبوبہ سے غالبؔ کی عشقیہ واردات اور معاملات کا مجموعی تاثر حزنیہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ تاثر حسبِ ذیل دو مشہور غزلوں کے منتخب اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو اسی دور (۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء) سے یادگار ہیں :

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

---

[1] غالبؔ کے خطوط (جلد دوم ص ۱۹۷) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکین، فریبِ سادہ دِلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو! کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ! یک قلم انگیز!
اے ترا ظلم! سر بسر انداز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

غالب نے یہ اشعار ۲۴ سال کی عمر سے قبل سپردِ قلم کیے تھے۔ اس وقت تک ان کی 'رندی' اور 'شاہد بازی' کے چرچے دِلّی کے گلی کوچوں میں عام ہو چکے تھے۔ لوہارو خاندان کے اکابرین (بشمول ان کے خُسر الٰہی بخش معروؔف) ان کی نوجوانی کی رنگ رلیوں سے بخوبی واقف تھے۔ الٰہی بخش معروؔف نے تو غالبؔ کی اس دور کی ایک عاشقانہ غزل کی تضمین تک لکھی تھی۔ کاش وہ اس غزل کے بین السطور معنی سے آشنا ہوتے، اور اُس "آفت" کو جان سکتے۔ جس میں غالبؔ اپنے "دِل کے ہاتھوں سے گرفتار تھے"

اپنا احوالِ دلِ زار، کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے ہی دل سے، میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ
حسبِ حال اپنے اشعار کہوں یا نہ کہوں[1]؟

ان کی اس دور کی ایک اور مشہور غزل کے بعض اشعار میں غالبؔ کی اس عشقیہ واردات کا دردناک عکس ملتا ہے۔ غالبؔ کا یہ شہکار بھی اسی 'ستم پیشہ' کا مرہونِ منّت معلوم ہوتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا (قبل ۱۸۲۱ء)

اس دور کے چند اور اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جن سے بھی "اک شخص کے تصور" کی کرنیں پھوٹتی ہیں ؎

زندگی یوں گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا (قبل ۱۸۲۱ء)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا (قبل ۱۸۲۱ء)

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا (قبل ۱۸۲۱ء)

---

[1] یہ غزل دیوان الٰہی بخش معروف (متوفی ۱۸۲۶ء) کے ایک مخمس میں ملتی ہے۔ اس لیے متداول دیوانِ غالبؔ میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ کالی داس گپتا رضاؔ نے اس لیے اس پر بھی "بعد از ۱۸۲۱ء" لکھا ہے (دیوان غالبؔ (کامل) ص ۲۰۳) حالاں کہ یہ ۱۸۲۱ء سے قبل کی بھی ہو سکتی ہے۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا (قبل ۱۸۲۱ء)

مرے دل میں ہے غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی (قبل ۱۸۲۱ء)

غالبؔ کی عشقیہ واردات میں صرف فراقی پہلو نہیں تھے۔ معاملہ بندی کی وہ تمام سطحات بھی موجود ہیں جو اس قسم کی آزاد محبت میں پیش آتی ہیں اسی لیے تو کہا ہے ؎

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر نہیں (قبل ۱۸۲۱ء)

اور جب "کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی" نہیں دیتا ہے تو یہ "عذرِ مستی" درمیان میں لا کر دھمکی دیتے ہیں:

ہم سے کھُل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن (قبل ۱۸۲۱ء)

اور اپنی "پیش دستی" کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں ؎

دَھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اور کبھی کبھی معاملاتِ عشق میں یوں بھی ہوتا ہے ؎

اسدؔ خوشی میں مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے، ذرا میرے پاؤں داب تو دے (بعد ۱۸۲۱ء)

ابھی غالبؔ دھول دھپّا اور پاؤں دابنے کی "رُخصتِ بے باکی و گستاخی" کی داد دینے بھی نہ پائے تھے کہ محبوبہ کی موت نے بساطِ عشق اُلٹ دی۔ غالبؔ کی ناکام اور مختصر محبت کی کلید اس شعر میں ملتی ہے ؎

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا (بعد ۱۸۲۱ء)

غالب کی رنگ رلیوں کا یہ دور ۲۴ ، ۲۵ برس کی عمر کے قریب ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ 'رندِ بادہ خوار' رہے لیکن 'شاہد بازی' اور 'غمِ عشق' سے منہ موڑتے گئے۔ ۱۸۲۶ء میں اپنے خسر الٰہی بخش معروف کے انتقال کے بعد وہ 'غمِ روزگار' میں مبتلا ہو گئے اور اسی سال اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے کلکتے کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ غالب اپنی متاہلانہ زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے بار بار لکھا ہے کہ وہ تاہل کے آدمی نہیں تھے اور نہ ایک عورت کے ساتھ ساری زندگی گزارنا (چاہے وہ حور کیوں نہ ہو) ان کا مشرب تھا۔ جو حالات و واقعات پہنچے ہیں ان سے علم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم سے انھوں نے ساری عمر نبھایا ہے۔ ان کے اور غالب کے درمیان کوئی شے قدرِ مشترک نہیں تھی ؛ مسکن الگ، کھانے کے برتن الگ ، وہ پنج وقتہ صلوٰۃ کی پابند، ان کی "طبیعت ادھر نہیں جاتی"، وہ روزہ دار، غالب روزہ خوار، غالب کی شراب نوشی ان کے لیے باعثِ آزار رہی۔ ان کی صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا ٹھٹھول وہ یہ کہہ کر اُڑاتے ، تم نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا رکھا ہے !

ایسے حالات میں غالب کا کسی طرحدار سے، جو غالباً مذاقِ سخن بھی رکھتی تھی، ربط و ضبط بڑھا لینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ غالب نے اسے اپنی شاعری میں کبھی شوخ، کبھی جفا مشرب، کبھی کافر صنم ، کبھی ستم گر اور ستم پیشہ اور کبھی 'ایک شخص' کے نام سے یاد کیا ہے۔ رسوائی کا خوف دونوں طرف تھا۔ غالب کو منہ چھپانے کے لیے 'غربت' کی تلاش تھی لیکن وہ 'ستم پیشہ' اپنی ہی آگ میں جل کر مر گئی۔ یہ اس کی دردناک موت تھی جس نے غالب سے "ہائے ہائے" والی غزل لکھوائی اور مرنے کے بعد بھی وہ ایک 'داغِ کہنہ' کی شکل میں غالب کے دروں میں جاگزیں رہی۔

پروفیسر مسعود حسین

اُردو زبان : تاریخ، تشکیل، تقدیر

۱۔ تاریخ

اُردو زبان صحیح معنوں میں ایک مخلوط زبان ہے، جیسا کہ اِس کے تاریخی نام، ریختہ سے بھی ظاہر ہے۔ یوں تو دنیا کی اکثر زبانیں دخیل الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے مخلوط کہی جاسکتی ہیں، لیکن جب کسی لسانی بنیاد پر غیر زبانوں کے اثرات اس درجہ نفوذ کر جاتے ہیں کہ اُس کی ہیئتِ کذائی ہی بدل جائے تو وہ لسانیاتی اصطلاح میں ایک مخلوط یا ملواں زبان کہلائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اُردو کی نظیر کہیں ملتی ہے تو فارسی زبان میں، جس کی ہند ایرانی بنیاد پر سامی النسل عربی کی کشیدہ کاری نے کلاسیکی فارسی کو جنم دیا۔ عَرَبی کے اس عمل کی توسیع جب فارسی کے وسیلے سے تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی ایک ہند آریائی بولی، امیر خُسرو کی "زبانِ دہلی و پیرامنش" پر ہوتی ہے تو اُردو وجود میں آتی ہے۔ اس لسانی عمل کی توسیع کی دیگر مثالیں کشمیری، سندھی اور پنجابی ہیں، لیکن 'زبانِ دہلی' کی طرح یہ کبھی بھی کُل ہند حیثیت اختیار نہ کرسکیں۔

اُردو کا نقطۂ آغاز ۱۱۹۳ء میں مُسلمانوں کا داخلۂ دہلی ہے۔ اس کا پہلا مُستند شاعر امیر خُسرو دہلوی ہے، جس کا ہندوی کلام غیر مستند سہی لیکن جس کا شاعرِ ہندوی ہونا مُسلّم ہے۔ خسروؔ کی مثنوی 'نہ سپہر' میں ہمیں پہلی بار ہندوستان کی معروف زبانوں کی فہرست ملتی ہے۔ یہ تعداد میں بارہ ہیں، سندھی، لاہوری (پنجابی)، کشمیری، ڈوگری (؟)، کنڑ (دھور سمندری) تلنگی گجراتی (گجر)، تمل (معبری)، مغربی بنگال (گوڑی)، مشرقی بنگالی (بنگال)، اودھی (اود) اور سب سے آخر میں "زبانِ دہلی و پیرامنش" (یعنی دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) ؏

ایں ہمہ ہندویست کہ زِ ایامِ کہن۔ یہ "مصطلحِ خاصہ" ہیں "نہ از عاریتے" (یعنی اپنی انفرادی خصوصیات رکھتی ہیں) ان کے علاوہ ایک اور زبان، برہمنوں کے نزدیک برگزیدہ" سنسکرت نام زعہدِ کہن"، بھی ہے، جس کے بارے میں خسرو رقم طراز ہیں" عامہ ندارد خبر از کن مکنش"

خسرو نے زبانِ دہلی کے ساتھ "پیرامنش" کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ "پیرامن" (اطراف) جاٹوں اور گوجروں کی زبان پر مشتمل تھا۔ جاٹوں سے منسوب کھڑی بولی اور ہریانوی ہیں اور گوجروں سے متعلق برج بھاشا۔ انھیں کے نسوانی حسن کے بارے میں خسرو اس طرح رطب اللسان ہیں:

گجری کہ تو در حُسن و لطافت چو مہی

ہر گاہ بگوئی کہ "دَہی لیہو دہی"

جاٹوں کی زبان کھڑی اور ہریانوی [ا] بنیاد بولیاں ہیں یعنی ان میں اسماء صفات اور افعال کا خاتمہ بالعموم [ا] پر ہوتا ہے۔ برج بھاشا [اُو] بنیاد کہی جا سکتی ہے جس میں اسماء، صفات اور افعال کا خاتمہ عموماً [اُو] پر ہوتا ہے۔ اسی لیے پُرانی ہندی کے عالم چندر شرما گلیری نے اسے کھڑی کے مقابلے میں 'پڑی بولی' کہا ہے۔

دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کا یہ ملغوبہ پرانی دِلّی کے بازاروں، حصاروں اور خانقاہوں میں تقریباً سو سال تک اپنی ابتدائی شکل میں ارتقاء پاتا رہا تاآں کہ تیرھویں صدی کے رُبعِ اوّل میں یہ فتوحاتِ علائی و تغلق کے ذریعہ گجرات کے راستے دکن تک پہنچ جاتا ہے۔ گجرات میں اُس کا مقامی نام 'گجری'، پڑا جو غالباً 'گُذری' کا مُہنّد ہے۔ 'گُذری' بازار کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا عمومی نام ہندی یا ہندوی قائم رہا۔ دکن میں سترھویں صدی عیسوی میں اس کا مقامی نام دکھنی یا دکنی پڑتا ہے حالاں کہ وجہی کی 'زبان ہندوستان' کی ترکیب اور فرشتہ کی 'ہندوستانی' میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ اس کا تعلق شمالی ہند سے ہے۔ سرزمینِ دکن میں جہاں یہ سلطنتِ بہمنیہ کے قیام کے بعد پھلی پھولی مراٹھی، کنڑ اور تلگو زبانیں رائج تھیں۔ پہلی کا تعلق ہند آریائی سے ہے جب کہ آخری دو دراوڑی زبانیں ہیں۔ مراٹھی چوں کہ متجانس ہند آریائی زبان تھی اس لیے اس سے لین دین کا کاروبار زیادہ رہا۔ حالاں کہ جن محققین نے دکنی پر مراٹھی کے اثرات کا شدّ و مد کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جن الفاظ کی نشان دہی وہ مراٹھی سے

کرتے ہیں ان میں سے بیشتر نواحِ دہلی کی بولیوں میں تلفظات کے ہیر پھیر کے ساتھ آج تک رائج ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے 'دکنی اردو' میں ایسے کئی سو الفاظ کی فہرست دی ہے جن میں سے ۸۰ فی صد الفاظ کی شناخت شمال کی ہندوی میں بآسانی کی جا سکتی ہے۔ البتہ ڈوسار بڈھا) بڑبڑا (بلبلا)، یکٹ پن، (اکیلاپن)، لٹی (بہت)، گڑگا (گھٹنا)، سپٹرنا (پانا)، پیلاڑ (پرے)، پاونا (مہمان)، دار (دروازہ) قسم کے الفاظ ضرور ایسے ہیں جو مراٹھی سے کلاسیکی دکنی میں بار پا گئے ہیں۔ مراٹھی نے دو اور ایسے لسانی ٹھپے دکنی اردو پر چھوڑے ہیں جو اس کے مخطوطات کی کلید بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک (چ) تحصیصی جو قدیم سے لے کر تا حال بول چال تک کی دکنی میں 'ہی' کے معنوں میں مستعمل ہے اور جو لاحقے کے طور پر اسماء، افعال اور حروف ہر جگہ بے دریغ استعمال ہوتی آئی ہے۔ شمالی ہند کے صرف ایک مصنف اسماعیل امروہوی نے اپنی مثنویات میں اسے دو تین بار استعمال کیا ہے لیکن اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں عالمگیری لشکر سے بیس سال تک منسلک رہا تھا اور اورنگ آباد اور اس کے نواح میں اس نے یہ زمانہ گزارا تھا۔ ایک دوسرا لفظ حرفِ انکار 'نکو' ہے جس کا ماخذ پھر مراٹھی ہے۔ شمالی ہند میں ولی کے زیر اثر صرف ایک دو شاعروں نے اسے ایک دو بار استعمال کیا ہے، ہر چند اس کا کوئی تعلق دہلی اور اس کے نواح سے نہیں رہا ہے:

مجھ کوں واعظ نکو نصیحت کر
یار جس سے ملے بتا دو فن (یک رو)

مراٹھی سے قطع نظر تلگو اور کنڑ کے اثرات کا بھی دکن کے بعض محققین، ڈاکٹر زور وغیرہ نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ اثر عام طور پر چند الفاظ اور محاورات پر مشتمل ہے اور وہ بھی تحریری نہیں تقریری زبان پر۔ میرے خیال میں اگر دکنی اردو کے لہجے پر کام کیا جائے تو ان زبانوں کے اثرات بدیہی طور پر نظر آئیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ اس قسم کا مطالعہ تحریری یا ادبی دکنی کا ممکن نہیں۔

گوجری اور دکھنی میں نمایاں فرق نہیں، جس کا ثبوت احمد گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" ہے جو اس نے گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قلی قطب شاہ کی دعوت پر گجرات سے گولکنڈہ آ کر لکھی تھی۔ جمیل جالبی کا یہ خیال کہ "یہ مثنوی گجری اردو کے ترقی یافتہ زبان و بیان کا قابلِ ذکر نمونہ

ہے "محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ اس میں سوائے عربی فارسی لغات کی قلت کے قواعد کی وہ تمام شکلیں پائی جاتی ہیں جو دکنی مصنفین کا امتیاز تھیں۔ حتیٰ کہ دکنی اردو کے کلیدی الفاظ 'نکو' اور (چ) تخصیصی تک موجود ہیں۔

ان لسانی شہادتوں کے پیشِ نظر میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ گجرات تا بیجاپور تا گولکنڈہ، ادبی حیثیت سے ایک محاورہ رائج تھا جسے ہم چودھویں صدی عیسوی کی زبانِ دہلی کہہ سکتے ہیں۔ چوں کہ شمال سے نواحِ دہلی کی ایک سے زائد بولیاں دکن پہنچیں تھیں اس لیے کچھ عرصہ تک ان میں آنکھ مچولی ہوتی رہی تاآں کہ وجہی، غواصی اور نصرتی جیسے باکمالوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ان کی معیار بندی ہو جاتی ہے۔

۱۶۸۶ اور ۱۶۸۷ سنہ ء میں بیجاپور اور گولکنڈا کے سقوط کے بعد اورنگ آباد ایک بار پھر سلطنتِ دہلی کا صدر مقام بن جاتا ہے۔ اورنگ زیب دکن میں ۱۶۸۲ء میں لال قلعہ دہلی کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر اورنگ آباد میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ شمال اور جنوب کے سارے دروازے ایک بار پھر کھل گئے۔ اورنگ آباد، شاہجہاں آباد کا ایک محلّہ معلوم ہونے لگا۔ ایسے میں وؔلی دکن کی خاک سے اُٹھے۔ ۱۷۰۰ء میں دہلی پہنچے، اور شاہ گلشن کے مشورے پر ریختہ کو "بموافق محاورۂ شاہجہاں آباد" کرنے کی کوشش کی۔ دیکھتے دیکھتے پچاس سال کے عرصے میں دہلی میں ریختہ گویوں کی ایک کھیپ سی نکل پڑی ع 'وؔلی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں' کے عقیدے کے باوجود وؔلی کی زبان میں دکنیت کی جو اجنبیت رہ گئی تھی اس پر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ سوداؔ ہی کے ایک شاگرد قائمؔ نے اس طرح طنز کیا ہے۔

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

مرزا مظہر جانجاناں اور حاتمؔ نے زبان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ متروکات کے نام پر اور 'مرزایانِ دہلی' کی سند لے کر بے شمار ہندی کے الفاظ پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ حاتمؔ کو شرم آئی تو اپنے ضخیم دیوان سے ۱۷۵۵ء میں ایک 'دیوان زادہ' کی تولید کی۔ اس کے بعد سوداؔ نے اپنے قصائد کے ذریعے اس میں فارسی لغات کا دہانہ چھوڑ دیا۔ میرؔ کہتے رہے کہ

ع معشوق جو ہے اپنا باشندہ دکن کا تھا

لیکن اس کے باوجود جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان لکھتے رہے۔

اس بڑی لسانی تبدیلی سے ہمارے ہندی کے دانشوروں کو، جس میں پریم چند کے سپوت امرت رائے پیش پیش ہیں، یہ نکتہ ہاتھ آیا کہ ولی سے قبل دکنی اردو کے ادب کے نام سے جو کچھ اردو کے محققین کی دیدہ ریزی کی بدولت برسرِ عام آیا ہے، وہ ہمارا یعنی ہندی کا ادبی ورثہ ہے۔ فسادِ خون شروع ہوتا ہے ولی سے اور اس کے بعد ہندی / ہندوی کا گھر تقسیم ہو گیا۔[1] اِس تقسیم کے پیچھے انھیں ایک گہری سازش نظر آتی ہے جس سے اردو کا شاخسانہ پھوٹتا ہے اور ہندی کی چندی ہونے لگتی ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے یہ علمی بددیانتی ہے۔ ماقبل دکنی اردو کا ادب اس قدر نرم لقمہ نہیں کہ ہندی اُسے ہضم کرلے۔ سب رَس یا نصرتی کے قصائد کی زبان، اردو کے ارتقا کے مدارج ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سب رَس کو دیوناگری میں منتقل ہوئے آج پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے لیکن نہ تو اُسے تاریخ ادبیاتِ ہندی میں اب تک جگہ مل سکی ہے اور نہ وہ ہندی کی درسیات میں شامل کیا جا سکا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ۱۹۶۲ء میں سب سے پہلے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ دستورِ ہند بنانے والوں کی سب سے بڑی بھول یہ ہوئی کہ اُنھوں نے آٹھویں شیڈول میں ہندی کے دوش بدوش اُردو کو بھی ہندوستان کی ۱۴ مقتدر زبانوں کی فہرست بناتے وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر جگہ دے دی۔ پنڈت جی سے جب دستور سازوں میں سے کسی نے یہ استفسار کیا کہ اردو کون بولتا ہے اور کہاں کی زبان ہے تو انھوں نے کہا یہ میرے گھر میں پیڑیوں سے بولی جاتی رہی ہے۔ امرت رائے نے ڈاکٹر گیان چند کے اس خیال پر یہ عمارت کھڑی کی کہ خیر اردو کے علاحدہ وجود کا اب آئینی جواز تو ہو گیا ہے لیکن اس ملک کی سالمیت کے لیے وہ دن روزِ سیاہ ہوگا جب ووٹ کی طاقت پر اُسے ہندی ریاستوں میں دوسری زبان منوا لیا جائے گا، جس کا سلسلہ بہار سے شروع ہو گیا ہے۔ اردو کو ان نئے بے ننگ و نام کہنے والوں کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] دیکھئے A HOUSE DIVIDED : OXFORD PRESS 1984

ع یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اُسی میں چھید کرتے ہیں

اس انداز پر سوچنے والے اس لسانی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دکنی اُردو کی شکل کو آپ لاکھ دکھنی ہندی کا روپ کہیں اور اسے دیوناگری رسمِ خط میں منتقل کیوں نہ کریں، وہ اُردو ہی کا ابتدائی ادب رہے گا۔ ہندی اسے برج بھاشا اور اودھی کے ادب کی طرح اپنی تاریخِ ادب کا جز نہ بنا سکے گی۔ بعینہ جس طرح برج بھاشا اور اودھی کے ادب کو اُردو رسم خط میں لکھ کر اردو تاریخ ادب کی روایت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اُردو کے ڈانڈے آج بھی گیت تا غزل پھیلے ہوئے ہیں لیکن کھڑی بولی پر اس کی اساس کا ہونا شرط ہے۔ اس کی رنگا رنگی، میر، نظیر، پریم چند اور غالبؔ سے لے کر رتن ناتھ سرشار اور اقبال تک قائم ہے۔

دراصل جدید اُردو کا ارتقا ایک مخصوص ڈگر پر تاریخی عمل میں ہوا ہے مثلاً اس کی مصطلحاتِ علمیہ کا میلان ابتدا سے عربی کی جانب رہا ہے۔ اس کی شعری روایت کا ماخذ شعرِ فارسی ہے اس کی تراکیب، تشبیہات اور استعارات پر فارسی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کا عروض بھی انھیں کا مرہونِ منت ہے۔ ہندوستانی، بول چال کی زبان بن سکتی ہے لیکن یہ فلسفہ و فکر اور علوم و اصطلاحات کی سطح پر مفلوج ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے رسم خط اور زبان میں گوشت اور ناخن کا رشتہ ہے۔ اس کی جگہ نہ لاطینی لے سکتا ہے اور نہ دیوناگری، جس کی تحریک ایک زمانے میں ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے شدّ و مد کے ساتھ کی گئی تھی۔ جس میں ڈاکٹر عبدالعلیم پیش پیش تھے۔

تقسیمِ ہند سے قبل بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں اُردو زبان کی ترقی ہمہ جہت انداز میں ہوتی رہی۔ پریم چند نے اسے کھینچ کر عوام کی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اقبال نے فکر کے شہپر دے کر اسے فلسفے کی چوٹی پر پہنچا دیا۔ اسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اپنی وضع کردہ اصطلاحاتِ علمیہ کے ذریعہ اسے اعلیٰ تعلیم کی گوں کا بنایا۔ اسی نسبت سے یہ ہندی سے دور ہوتی گئی جس نے اپنی توسیع کے لیے سنسکرت کا قبلہ منتخب کیا۔ کانگریس گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستانی 'دونوں لکھاوٹوں میں' کا پرچار کرتی رہی۔ ۱۹۲۵ء کے کانپور والے اجلاس میں کل ہند زبان کے لیے 'ہندوستانی' کا ریزولیوشن تالیوں کی گونج میں پاس ہوا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے

سیاسی بازی مکمل طور پر ہار لی تو ہندی اردو کا معاملہ دو ٹوک ہوتا گیا۔ آزادی ملنے کے فوراً بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی کی ایک مسلم چیلی، ریحانہ طیب جی نے ان کی لسانی پالیسی پر طعنہ زنی کرتے ہوئے انھیں لکھا "اگر آپ نے ناگری کے ساتھ اُردو کو بھی قومی لکھاوٹ بنالیا تو آپ ہندوستان کے اندر ایک دوسرا پاکستان کھڑا کر دیں گے۔" تو اس مردِ درویش کا جواب یہ تھا "اگر ہم ہندو کو یا مسلمان کو ایک ہی لکھاوٹ میں لکھنے کے لیے مجبور کریں تو ہم اس کے ساتھ ناانصافی کریں گے۔ اور جب یہ ناانصافی اقلیت کے ساتھ ہو تو اکثریت کا گناہ دُگنا مانا جائے گا۔"

گاندھی جی نے اپنے ان خیالات کو ایک جگہ "ریت کی رسّی بٹنے" سے تعبیر کیا ہے۔ تقسیم ہند پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا مشن پورا کر چکے تھے۔ زمام کار اب دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔ نفرت کا جو سمندر چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا اس سے نہ وہ خود بچ سکے اور نہ اپنی ہندوستانی کو بچا سکے۔ اردو والوں نے وطن سے دور نئی بستیاں بسانے کے لیے فرار شروع کیا لیکن اس سیاسی افراتفری اور انتشار کا ایک مثبت پہلو بھی نکلا۔ پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی علمی و تعلیمی زبان اردو تھی۔ ان کی مادری زبان پنجابی تھی، لیکن علمی و تعلیمی زبان کی حیثیت سے وہ عرصۂ دراز سے اردو کو اپنا چکے تھے۔ ہندوستان میں اُنھیں جدید ہندی کی جو سوغات پیش کی گئی اُسے انھوں نے اپنے بچّوں کے لیے تو محفوظ کر لیا لیکن خود ذہنی کشمکش کے باوجود اردو میں حوصلۂ قلم و رقم کرتے رہے۔ صحیح معنوں میں یہ صورت نکلی گویا

ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

لہٰذا ان کی دلچسپی سے بہت جلد اردو نے پر و بال سمیٹے اور ایک نئی پرواز کے لیے تیار ہو گئی۔ اس عمل کو اُتر پردیش سے زیادہ دہلی میں دیکھا جا سکتا تھا، جہاں نفرت کی جمنا زیادہ گہری تھی۔ سیکڑوں پنجابی نژاد شاعر اور افسانہ نویس نکل آئے اور ایک طرح سے اردو کی ادبی قیادت انھوں نے سنبھال لی۔ اِدھر جوں جوں سیاست میں ٹھہراؤ آنے لگا، فرار کے بجائے قرار ہندی مسلمانوں کی روش ہوتی گئی۔ اردو کے بدخواہوں نے اس ہنگامِ باد آورد سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں اور اداروں کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ پُرشوتم داس ٹنڈن نے ایک موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین سے کہا تھا "ڈاکٹر صاحب اُردو کا جھگڑا بہت جلد فیصل ہو جائے گا،

ہم لوگوں کو صرف پچیس سال کی مہلت چاہیے۔" ان کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت نہ ہو سکی۔ اردو برباد تو کر دی گئی لیکن بہت جلد اس کو آباد کرنے کی تحریک بھی چل نکلی۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین ہی کی قیادت میں لاکھوں دستخطوں سے ایک محضر راشٹرپتی راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ساتھ ساتھ دستور کی دفعات ۳۴۴، ۳۴۷ اور ۳۵۰ کے تحت اُردو کے بنیادی حقوق کا مطالبہ شروع ہوا۔ بالآخر ریاست بہار میں کامیابی ہوئی اور وہاں کے ریاستی لسانی ایکٹ میں ترمیم کر کے ہندی کے ساتھ اردو کو بھی جگہ دی گئی۔ ریاست جموں وکشمیر اس سے بہت قبل اُردو کو ریاست کی واحد سرکاری زبان تسلیم کر چکی تھی۔ ہماچل پردیش نے اُردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے جگہ دی۔ آندھرا پردیش میں اُردو کو لسانی مراعات دی گئیں۔ معاملہ جا کر اٹکا تو اتر پردیش میں، جہاں بہار کے نمونے پر اُردو کے لیے آرڈی نینس نکلتے نکلتے رہ گیا اور اب تک اردو کا مقدمہ عدلیہ کی غلام گردش میں سرگرداں ہے۔ مرکزی سرکار نے چند سال قبل ترقی اُردو بورڈ (بعد کو بیورو) اردو کی درسی اور اشاعتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا اور مختلف ریاستوں نے بھی اس غرض سے اردو اکادمیاں قائم کیں۔

لیکن اردو کے بارے میں آج بھی اکثریت میں تعصب کا دُھند باقی ہے۔ سی پی آئی جیسی روشن خیالی کی دعوے دار پارٹیاں بھی ٹھوکر کھا کر جاتی ہیں، اور امرت رائے اور نامور سنگھ جیسے ترقی پسند ادیب بھی آج کل اُردو کے درپے نظر آرہے ہیں۔ دوسری طرف خود اہلِ اُردو تا حال ہزیمت خوردگی کی ذہنیت کا شکار ہیں۔ چونکہ انھیں اپنی زبان کی قدر کا احساس نہیں اس لیے خدمتِ لب کے علاوہ اس زبان کے سلسلے میں کچھ کرنے کو تیار نہیں۔

تاریخِ لسانیات شاہد ہے کہ زمانے کی گردشوں میں زبانیں پیدا ہوتی ہیں، بنتی ہیں، بگڑتی ہیں، پھر جنم لیتی ہیں یا مٹ جاتی ہیں۔ ہندوستان میں اُردو کے سلسلے ہیں اہلِ اُردو کے سامنے دونوں صورتیں موجود ہیں، اس کی بقا یا فنا، موت ہمیشہ زندگی سے آسان ہوتی ہے۔ لیکن

ع زندگی نام ہے مَر مَر کے جیے جانے کا

۲۔ تشکیل

تشکیل کے نُقطۂ نظر سے اُردو زبان کے ارتقاء کو چار واضح اَدوار دیکھا جاسکتا ہے۔

(۱)	دَورِ اوّل :	قدیم اُردو، شمال میں	۱۲۰۰	تا	۱۴۰۰ء
(۲)	دورِ دُوم :	قدیم اُردو، دکن میں	۱۴۰۰	تا	۱۷۰۰ء
(۳)	دورِ سُوم :	درمیانی اردو	۱۷۰۰	تا	۱۸۵۷ء
(۴)	دورِ چہارم :	جدید اُردو	۱۸۵۷	تا	حال

(۱) اگر ہم اردو کا نقطۂ آغاز مسلمانوں کے داخلہ دہلی کو قرار دیں تو ۱۲۰۰ تا ۱۴۰۰ سنۂ اس کا دورِ اول شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے تحریری نمونے ہمیں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے مستند حصوں اور صوفیہ کے ہندی اقوال میں ملتے ہیں جو فارسی تالیفات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ صوفیہ کے اقوال سے لسانی نتائج کا استخراج اِس لحاظ سے مُشتبہ رہتا ہے کہ اُن کے ادا کرنے والے صوفیوں کا تعلق ملک کے مختلف حصص سے رہا ہے، تاہم ایسے صوفیہ کے ہندوی اقوال جن کا تعلق دہلی اور اس کے نواح سے رہا ہے، اس سلسلے میں مُستند تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے بابا فرید شکر گنج اور شیخ حمید الدین ناگوری کے اقوال لائق اعتبار نہیں۔

خسرو کے مستند ہندوی کلام اور ان صوفیہ کے اقوال کا تجزیہ کیجئے تو حسبِ ذیل قواعدی شکلوں کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے :

(۱) اُردو کا ابتدا سے [ا] بنیاد بولی / بولیوں پر مبنی ہونا اس کا سلسلہ موجودہ کھڑی اور ہریانوی بولیوں سے ملتا ہے۔ اس خصوصیت کی مزید تائید پنجابی سے ہوتی ہے۔ دہلی میں داخل ہونے سے قبل مسلمان تقریباً ڈیڑھ سو سال تک لاہور میں قیام کر چکے تھے۔ مسعود سعد سلمان کے ہندوی کلام کا ذکر امیر خسرو تک نے کیا ہے۔ لیکن یہ غالباً لاہوری (پنجابی) میں ہوگا، زبانِ دہلوی میں نہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی کا لسانی نظریہ۔ اُردو پنجابی سے نکلی ہے۔ کلّی طور پر مستند نہیں لیکن ابتدائی اردو پر پنجابی کے اثرات ناگزیر ہیں۔ [ا] بنیاد ہونا اسی ضمن میں آتا ہے۔

(۲) صوتیاتی نُقطۂ نظر سے عربی فارسی لغات کے داخلے کے ساتھ ق، ف، ز، خ، غ آوازوں

تجز صوتوں کا چلن۔ ان میں [ق] کے بارے میں تیقن سے نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اسے نہ پنجاب نے قبول کیا اور نہ دکن نے۔ لیکن باقی چار مستعار آوازوں کا 'زبانِ دہلی میں داخلہ کم از کم اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقات میں یقینی ہے۔

(۳) ابتدا سے اردو زبان کی انفرادیت کی ایک نشانی اس کا رسمِ خط بھی ہے جو عربی فارسی رسمِ خط کی توسیع کا یہ عمل کوز (RETROFLEX) آوازوں سے یقینی طور پر شروع ہو گیا تھا اور ہند آریائی ٹ، ڈ، ڑ آوازوں کے لیے نقطے لگا کر ت، د، ر سے امتیاز کیا جانے لگا تھا۔ جہاں تک نفسی (ASPIRATE) آوازوں کا تعلق ہے ابھی تک دو چشمی (ھ) ان کے لیے مختص نہیں ہوئی تھی اور ہائے مختفی کی مختلف شکلوں ہی سے کام لیا جاتا تھا اس طرح کہ 'گھر' اور 'گہر'، 'دھر' اور 'دہر' کا امتیاز صرف سیاق سباق سے کیا جاتا تھا۔

(۴) ہریانی اور کھڑی کے زیرِ اثر تخفیفِ حرفِ علت (جدید صوتیات کی اصطلاح میں تخفیفِ مصوتہ کا رجحان عام تھا۔ یہ رجحان سفر کر کے دکن پہنچا اور دکنی اردو کا امتیازی نشان بن گیا، اُردو نے اپنے آگرہ کے ڈیڑھ سو سالہ قیام میں اس رجحان سے نجات پائی ہے۔ صوفیہ کے اقوال میں کھٹ (کھاٹ) لت، لک (لاکھ) وغیرہ اس کی مثال ہیں۔

(۵) خیر المجالس کے ہندوی فقیروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بول چال کی زبان میں /ڈ/ کو /ڑ/ پر فوقیت دی جاتی تھی مثلاً 'بڈا' بجائے 'بڑا'، اور 'چھڈا' بجائے 'چھڑا'۔

(۶) قدیم اُردو کے دوسرے یعنی دکنی دور (۱۴۰۰ تا ۱۷۰۰ء) تک آتے آتے اردو کی قواعدی شکلوں اور رسمِ خط دونوں میں استقامت آجاتی ہے۔ تین سو سال کے اس دور میں تصانیف کی اس قدر بہتات ہے کہ ہم ان کی بنیاد پر قطعی لسانی فیصلے کر سکتے ہیں۔

صوتیات کی سطح پر حسبِ ذیل نمایاں خصوصیات ہیں:

(۱) تخفیفِ مصوّتہ: یعنی بڑے مصوّتوں کو چھوٹے مصوّتوں میں تبدیل کر دینا۔ یہ کھڑی اور ہریانوی کی صوتیات کے زیرِ اثر ہے۔

آسمان، ہت، بند، بدل، سرج، پھل، سنّا، ستھی وغیرہ۔

(۲) مصوّتوں کا انفیانا یعنی غُنّہ کا اضافہ

بولناں، بونٹی، توں، مُنج، کونچے کونچے

(۳) نَفسیت (ہکاریت) کا حذف

چڑنا، سوکا، باندنا

(۴) کوز آوازوں کو دندانی میں تبدیل کر دینا۔

ڈھنڈنا ٹٹنا، دانٹنا، دھنڈورا

(۵) (ق) کا (خ) میں تبدیل کر دینا

اَخلَ، خطرہ (قطرہ)

حرفی خصوصیات

جنس : موجودہ اردو کی رُو سے تذکیر و تانیث میں غتربود۔

مثلاً بعض مؤنث، مذکر ملتے ہیں :

دعا، راہ، ہستی، بلندی، لذّت، محبّت، نیّت، جان، آواز، مدد، چھاؤں، تحریر، نماز، بات، عیدگاہ، مجلس، مسجد

تعداد : جدید اردو کے برعکس دکنی اردو میں جمع کی معروف علامت "اں" ہے۔

ہاتاں، عورتاں، باتاں، کتاباں، لوگاں

ہرچند (وں) اور (ں) کی جمع کی مثالیں بھی خال خال مل جاتی ہیں۔

اسمائے ضمیر

مخصوص اسمائے ضمیر میں ہوں (= میں)، مُنج (مجھے) ہمنا (ہمیں)، مُو (میرا)، اَپے (آپ)، تیں (تو) تُمن، اُو (وہ)، اُنے (وہ)، وِن کا (اُن کا)، جے (جو)، جنوں (جنھوں)، کن (کون)، یُو (یہ)، اِے (یہ)، اُنوں (ان کو)، کچ (کچھ) قابلِ ذکر ہیں۔

افعال

دکنی اُردو میں ماضی مطلق الف کے اضافے سے نہیں بلکہ [یا] کے اضافے سے بنتا ہے۔ اِس علامت میں یائے مخلوط ہے اس لیے وزنِ شعر میں اسے الف کے برابر مانا جاتا ہے۔ یہ ہریانوی کی مستقل خصوصیت رہی ہے۔

رکھیا، دیکھیا، کریا، اُٹھیا، آٹھیا۔

ع مبارک باد دینے آیا نوروز تج دوبار (محمد قلی قطب شاہ)

دکنی اُردو کے افعالِ ناقص موجودہ اُردو سے خاصے مختلف ہیں۔ ہے، ہیں، تھا، تھی، تھے کے ساتھ اَ ہے، اَ ہیں، اَ تھا، اَ تھی اور اَ تھے بھی رائج تھے۔

مستقبل بنانے کے لیے گا، گی، گے کے علاوہ دکنی اردو کی ایک خصوصی شکل (س) کے مرکبات سے بنتی ہے جیسے، مارسوں (ماروں گا)، مارے (تو یا وہ مارے گا)۔ یہ غالباً پنجابی سے مستعار ہے۔ خیر المجالس کے ایک ہندوی فقرے "ارے مولانا! یہ بڈا ہوسی" (یعنی ایں مرد بزرگ خواہد شد) میں یہ پہلی بار دکھائی دیتی ہے۔

دکنی کے مخصوص متعلق فعل حسب ذیل ہیں:

ہَو (ہوے)، اِتا، اِتال (اب)، جدہاں (جب)، کَد، کَدھیں (کب) جَم (ہمیشہ) جاں (جہاں) کاں (کہاں)، آنگیں (آگے)، بھِترال (اندر)، اُپرال (اوپر)، تَلار (تلے)، نِزک (نزدیک) ایلاڑ (اِدھر)، پیلاڑ (پرے)، کی (کیوں)، کے (کیوں)، ایتا (اتنا)، یتا (اتنا)، ہو (ہاں) (لیکن اس کے ساتھ گردن نفی میں ہلتی ہے)

حروف

علامتِ اضافت کے لیے کا، کی، کے علاوہ کیرا، کیری اور کیرے بھی آتے ہیں۔

علامتِ مفعول، کیوں اور تئیں

حروفِ جار: مُنے (میں) سُوں (سے) سیتی (سے)، تِین (سے)، پُو (پر)، گَدن (طرف)

حروفِ عطف: ہُور

حروفِ استدراک: پَن (پر)

حروفِ استثناء: باجے، بِغِر،

حروفِ تخصیص

(چ) تخصیصی، دکنی اردو کا خاص حرف ہے جو مراٹھی سے مستعار ہے۔ یہ اِسم فعل اور حرف ہر جگہ مرکب ہو سکتا ہے۔

نحوی خصوصیات

دکنی اردو کی نثر پر عربی فارسی کے نحوی اثرات نمایاں ہیں۔ عام ترتیب فاعل پہلے، پھر مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے۔ صفت موصوف سے قبل آتی ہے اور متعلق فعل سے قبل حروف تخصیص کلمے کے ساتھ آتے ہیں۔ البتہ مطابقت میں دکنی اور جدید اردو میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱) موجودہ اُردو میں فعلِ متعدی اپنے مفعول کے تابع ہوتا ہے مثلاً میں نے روٹی کھائی' ہم نے روٹی کھائی، ہم نے روٹیاں کھائیں۔

(۲) دکنی اردو میں فعل متعدی اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً

واحد مذکر	واحد مؤنث	جمع مذکر	جمع مؤنث
میں روٹی کھایا	میں روٹی کھائی	ہم روٹی کھائے	ہم روٹی کھائے/کھائیاں

جمع مؤنث کا اثر امدادی فعل تک پہنچتا ہے۔

"جو کچھ باتاں بولنے گیاں تھیاں" (سب رس)

صفت اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہے۔

ع کچیاں، کونلیاں کنواریاں ناریاں کلیاں کو نوروز آیا (محمد قلی قطب شاہ)

دکنی اردو میں جنس میں مطابقت کے علاوہ جمع مؤنث کی صورت علامتِ اضافت کی بھی جمع بنائی جاتی ہے مثلاً

" محبت کیاں چار باتاں " 'ناز کیاں باتاں'

علامت جمع کی کوئی مثال شمال کی اردو میں نہیں ملتی البتہ جمع مؤنث کا اثر صفت اور فعل پر شمال کی اُردو میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۳) دورِ سوم : درمیانی اُردو ۱۷۰۰ تا ۱۸۵۷ء

اِس دور کا تمام تر ادب شمالی ہند سے متعلق ہے، اور بیشتر شاعری پر مشتمل ہے شاہ مُبارک آبرو اور فائز۔ اس عہد کے اولین شاعر ہیں لیکن زبان کی صفائی کے سلسلے میں مظہر جانجانان اور شاہ حاتم نے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔

صوتی خصوصیات

(۱) تخفیفِ مُصَوتہ اِس دور کی بھی خصوصیت ہے لیکن اس حد تک نہیں جس حد تک دکنی اُردو میں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ۱۴۰۵ء تا ۱۶۴۸ء آگرہ سلاطین لودھی اور مغلوں کا دارالسلطنت رہا ہے جو عین برج کے علاقے میں واقع ہے اور برج ایک غیر مشدّد، طویل مصوتوں والی زبان ہے۔ نوادر الالفاظ (۱۷۵۱ء) میں خانِ آرزو کا جو ردِّ عمل عبدالواسع ہانسوی کے تلفظ کے خلاف ملتا ہے وہ اس ہی بات کا غماز ہے۔ تاہم تخفیفِ مصوتہ کی خاصی مثالیں اِس دور کے مصنّفین کے یہاں مل جاتی ہیں جن کی صفائی بعد کی اُردو میں ہوگئی ہے مثلاً چندنی، چدّریں، سُرج، چُٹ (چوٹ)، گَل (گال)

(۲) مصوتوں کو انفیانے کا رجحان بھی عام رہا ہے۔

نیں (نے) سیں (سے)، مُلاّں (مُلاّ)، کرناں (کرنا)، ساوَن (ساون) پریں (پری)، نانک، ناچ، تیریں، میریں، گیاراں، باراں، تیراں (جو آج تک اہلِ دہلی کا تلفظ ہیں)

(۳) ساکن کو متحرک بنا دینا عوام تک محدود نہیں مرزایانِ دہلی بھی اس کے مرتکب ہوتے رہے ہیں: نَذَر ؏ دل کو نذر کر و تب اس پر نظر کرو۔ (حاتم) گَرَم، حُسَن

(۴) درمیانی (ہ) اور نفسی (ھ) کو حذف کر دینے کا رجحان تاحال جاری ہے۔ قدمائے دہلی کو بھی اس سے مفر نہیں رہا ہے۔

نَیَں (حاتم)، کاچن (فائز) پنکڑی (فائز)، راک (فائز)

اس کا الٹا رجحان یعنی ہائے مخلوط (ھ) کا اضافہ بھی ملتا ہے جو دکنی اردو میں ہم دیکھتے آئے ہیں: بگھولے (آبرو)، تڑپھنا (میر)، ہُونٹھ (ہوں)۔ قصہ مہرافروز)، کلھ (کل۔ کربل کتھا) بھاکھی (نوادر)، مچھلکا (میر)

(۵) [ڑ] پر [ڈ] کو ترجیح کی روایت گاہ گاہ جاری

کاڈھ (آبرو)، بڈھاونا (نوادر)، بٹوھئی (کربل کتھا)، بڈھیس (نوادر)، ڈیوڈھی (نوادر)

صرفی خصوصیات

جنس کا غتر بود دکنی اُردو کے پیمانے پر نہیں تاہم پایا جاتا ہے۔

مذکر : بہار (فائز)، جان (آبرو، میرؔ) سوگند، غرض، اصل، آیت، راہ، وحی، کمر، شام (میرؔ)

تعداد

جدید اُردو کی مُستند علامتِ جمع (- وں) اس دور میں راسخ ہوگئی ہے۔ اس کا تعلق کھڑی سے ہے۔ (سہارن پور کے روشن علی نے عاشور نامہ میں (۱۶۸۸ء) اس کا بھرپور استعمال کیا ہے) شاہ حاتم کے دیوانِ قدیم میں (- وں) کی جمع پر مُشتمل قافیہ میں ایک مکمل غزل موجود ہے۔ البتّہ کبھی کبھی بھتّواں، انکھیاں، لٹاں، دانتاں، انجھواں، جیسی جمعیں ملتی ہیں، لیکن وہ غالباً فارسی کے زیرِ اثر ہے۔

اسمائے ضمیر اس دور میں جدید ہوگئے ہیں اس کے کہ کہیں کہیں تُمن، تُمناتیں، ہمن، ہمنا، وَے سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ ع کہ جس کی نگہ کے بندھے ہیں ہمن (آبرو) تیَں (تو) اس دور میں کمتر مگر برابر ملتا ہے۔ پلیٹس نے اپنی قواعد (۱۸۸۴ء) میں اِسے متکلم اسمائے ضمیر میں شامل کیا ہے اِس نوٹ کے ساتھ کہ اب متروک ہوگئی ہے۔ اِس کی مثالیں سوداؔ اور میرؔ تک کے کلام میں مل جاتی ہیں۔

ضمیرِ استفہامیہ

کِسو، کی ضمیرِ فضلی، عیسوی خاں، میرؔ اور غالبؔ سب نے استعمال کی ہے۔ غالبؔ نے اِس کو بعض مقامات پر خطوط تک میں روا رکھا ہے۔

یو (یہ) اِنو (اِن) ئیے (جمع یہ)، وے (جمع وہ) وِس، وِن، اِناں قابلِ ذکر ہیں۔

افعال

موجودہ اُردو میں علامتِ مصدر 'نا' ہے لیکن اٹھارہویں صدی تک ایسے مادّے جو حروفِ علّت (مصوّتوں) پر ختم ہوتے تھے ان میں اکثر 'نا' سے پہلے ایک 'و' کا اضافہ کر دیا جاتا تھا، مثلاً جاؤنا، پیونا، کھاؤنا، گاؤنا، آونا، اِس صدی کے آخر تک یہ شکل غائب ہوجاتی ہے۔

مضارع میں متداول شکلوں کے علاوہ [و] کے اضافے کی شکلیں بھی اس دور میں رائج رہی ہیں جیسے، ہووے، دیوے، چھپاوے، لیوے۔ یہ عوام میں آج بھی رائج ہیں لیکن ٹکسال باہر ہیں۔

اِس دور کی اُردو میں مستقبل کی سب سے دلچسپ شکل جمع مؤنث کی ملتی ہے جہاں علامتِ مستقبل بھی جمع کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہ اب قطعاً متروک ہے مثلاً

"ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر پھریں گیاں" (کربل کتھا)

مستقبل کی علامت گا، گی، گے کبھی کبھی زمانۂ حال کے لیے بھی استعمال کی جاتی تھی۔ یہ اب بھی عام بول چال میں مغربی یوپی میں سُنائی دیتی ہے لیکن معیاری اردو سے ٹکسال باہر ہے مثلاً

"ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر" (کربل کتھا)

فعل کی یہ شکل میر تقی میرؔ بلکہ ان کے بعد تک جاری رہی ہے۔

ماضی مطلق میں سب سے قابلِ توجہ شکل جمع مؤنث کی ہے جہاں فعل دیگر زبانوں کی طرح فاعل کے مطابق آتا ہے۔ میرؔ کی اس غزل کے قوافی ملاحظہ ہوں۔

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں — رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

اس غزل کے مزید قوافی چلوائیاں، مرجھائیاں، جھمکائیاں، ٹھیرائیاں، کھائیاں، بتلائیاں، اور رلوائیاں ہیں۔ انیسویں صدی کے آتے آتے یہ صیغہ متروک ہو جاتا ہے۔

اس دور کے حسبِ ذیل متعلق فعل خصوصیت رکھتے ہیں۔

ایدھر، دوَں (اِس طرح)، اودھر، تدھر، پھر، آگوں، نپٹ (بہت) جد، توں، کدھو، کد (کب) اِیتا (اتنا)

حروف حسبِ ذیل لائقِ توجہ ہیں:

سیں، سیتی، سوں، تے، لک، نوں (تک)، کوں، موں (میں) منے (میں)،

نحوی خصوصیات

اُردو جملے میں فاعل، فعل سے قبل آتا ہے اگر فعل لازم ہو، لیکن اگر جملے میں فعل متعدی ہو تو پہلے فاعل، اس کے بعد مفعول اور سب سے آخر میں فعل آتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی اردو میں عربی فارسی کی نحوی ساخت کے زیرِ اثر یہ ترتیب اکثر بدل جاتی ہے مثلاً

"اسباب تجارت کا بہت سالایا" (باغ وبہار)

"اقلیم ہندوستان کی میں ایک شہر تھا" (قصہ مہرافروز)

فاعلی 'نے' کے حذف کی وجہ سے بھی اس عہد کی اردو میں ترتیب کلام میں فرق پڑجاتا تھا۔

"تب عباس کہے" (کربل کتھا)

فاعل جمع مؤنث ہو تو اس کا فعل بھی اس کے تابع ہوتا تھا:

"یہ باتیں ہوتیاں تھیں ..." (باغ وبہار)

فاعل جمع مؤنث ہو تو صفت بھی جمع کی شکل اختیار کرلیتی تھی:

ع نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں (سودا)

اردو کے نحوی ارتقا کی شکل کو نہایت خوبی سے اس جملے کی مدد سے دکھایا جاسکتا ہے:

(۱) جواہرات کیاں رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں (دکنی اردو
۱۴ویں پندرھویں صدی)

(۲) جواہرات کی رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیا (شمالی ہند
سترہویں صدی)

(۳) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریاں تھیں (اٹھارہویں صدی)

(۴) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریں تھیں (اُنیسویں صدی)

(۵) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھری تھیں (جدید دور)

غرضیکہ انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان اپنی صوتیات، صرف ونحو اور کسی حد تک لغات کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی معیار بندی اختیار کر چکی تھی کہ سارے ہندوستان کے شعرا و ادیب اس کی پیروی ضروری سمجھتے تھے۔ ۱۷۹۲ء میں مرزا جان طپش دہلوی نے ڈھاکہ میں بیٹھ کر وہاں کے نواب کے حکم سے ایک مختصر سی لغت "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" مقامی معاصروں کی رہنمائی کے لیے لکھی۔ سید انشاء اللہ خاں نے ۱۸۰۸ء میں اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'دریائے لطافت' تصنیف کی اور میر تقی میر کے "لہجہ اکبرآباد و شمولِ الفاظِ برج گوالیار در وقتِ تکلم" کی جانب اشارہ کیا۔

اردو کی نوک پلک کی درستی، بالآخر شیخ امام بخش ناسخ اور ان کے پیرووٗں نے لکھنوٗ میں کی۔ ناسخ (متوفی ۱۸۳۸ء) کی اردو دانی کے غالب جیسے دلّی والے تک قائل تھے۔

(۱) مضارع کی (۔تا) اور اس کی شکلوں پر مہر سند لگ جاتی ہے (حالاں کہ غالب ع

کھینچتا ہوں جس قدر مجھ سے وہ کھنچتا جاتے ہے۔ اس کے بعد بھی لکھتے رہے)

(۲) 'و' زائدہ سے مرکب افعال کی شکلیں متروک ہونے لگیں جیسے دیوے، لیوے، ہووے' ہووےگا، دیویں گے، لیویں گے' حالانکہ مغربی یو۔پی اور اودھ کے خاص گھرانوں میں ان کا رواج بعد تک رہا ہے۔

(۳) علامت گا۔گی۔گے کا مضارع کے لیے استعمال یک قلم متروک ہوگیا۔

(۴) مؤنث جمع اسم سے فعل کا متاثر ہونا مثلاً "گھٹائیں چھائیاں" متروک قرار پایا۔ ہرچند میر انیس اپنے خاندان کی زبان کہہ کر آئیاں، جائیاں، بجائیاں لکھتے رہے۔

(۵) اسماء ضمائر میں حسب ذیل متروک قرار پائے۔ تئیں (تو)، تس (اُس = ع ایک دل تس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے (غالب) کسو (میر اور غالب)۔ وے (جمع وہ) یے (جمع یہ)

(۶) حروف میں حسب ذیل متروک قرار پائے۔

آگو، سیتی، کبھو، جوں، نت، پرے (میر و غالب) بن (غالب)

(۷) اسماء میں عرصۂ دراز سے مستعمل بعض الفاظ متروک قرار پائے۔

دِوانہ (میر)، جگ، پات (میر)، جاگہ (میر)، ماٹی (تمام متقدمین) دارو، شور شرابا، پرواہ (ہائے مختفی کے ساتھ)، لوہو (میر) وغیرہ۔ دلّی میں غالب اور لکھنوٗ میں میر انیس نے ان اصلاحات کا ہمیشہ تتبع نہیں کیا تاہم آخرالامر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ غالب رجب علی بیگ لکھنوی کی زبان دانی کے معترف تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے زمانے تک قواعدِ زبان کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ خاص طور پر اردو نحو پر فارسی کے اثرات قائم رہے۔ سرسید تک نے وے (جمع وہ) اور کرکر' کا استعمال روا رکھا۔ انھیں سے بدعت انگریزی الفاظ کی چلی۔ ان کے معاصرین جو انگریزی میں شُد بُد رکھتے تھے انگریزی کے الفاظ بے دھڑک استعمال کرنے لگے۔ صحافت نے اس رُجحان کو مزید تقویت دی۔

انیسویں صدی کے ربع اول تک نذیر احمد، حالی، شبلی اور شرر کی بدولت ایک کل ہند معیار کی تشکیل ہو چکی تھی۔ فرہنگ آصفیہ اور امیر اللغات کے اجزا مرتب ہو چکے تھے اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں مولوی عبد الحق نے اردو قواعد کا پہلا ایڈیشن شائع کر کے اس کا قواعدی چوکھٹا متعین کر دیا۔

تاہم ذخیرۂ الفاظ کی توسیع کا سلسلہ جاری رہا۔ ابوالکلام آزاد اور اقبال نے اسے عربی و فارسی کا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ پریم چند نے اس کے ڈانڈے ہندی سے جا ملائے لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم کام جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے کیا اور اصطلاحات سازی کے ذریعہ عربی کا دہانہ اس میں کھول دیا۔ اصطلاحات سازی کے سلسلے میں اس وقت بھی دو انداز فکر تھے اور اب بھی ہیں۔ بعض لوگ سائنسی مضامین میں بین الاقوامی اصطلاحات کے طرف دار ہیں۔ ہندی ڈائرکٹریٹ، مرکزی سرکار کا اصرار رہا ہے کہ سنسکرت کی اصطلاحات کو قبول کر لیا جائے تاکہ کم از کم اس سطح پر زبانوں میں یکسانی رہے۔ حالاں کہ تمل انھیں رد کر چکی ہے۔ اُردو کے لیے ان سنسکرت بنیاد اصطلاحات کو قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے چارۂ کار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم علوم معاشرتی کے لیے اپنی اصطلاحات خود وضع کریں اور علوم طبیعی میں کچھ اپنی اور کچھ بین الاقوامی، تلفظ کے ہیر پھیر کے ساتھ قبول کر لیں۔ بین الاقوامی اصطلاحات کو جوں کا توں قبول کرنے میں بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ اُردو کی صَرف پر ان کا زبردست بوجھ پڑتا ہے۔ علمی اصطلاح سے جو شاخسانے پیدا ہوتے ہیں وہ صرفی شکلوں کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں جو کسی بھی زبان کو مصنوعی بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اِس سلسلے میں ہمیں پڑوسی ملک کی کارگزاری پر بھی نظر رکھنی پڑے گی۔ جہاں اصطلاح سازی کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ لاطینی بنیاد اصطلاحات کا اشتراک تو امریکن اور انگلستان کی انگریزی تک محدود نہیں یوروپ کی تمام بڑی زبانیں ان کے زمرے میں آجاتی ہیں۔

۲۔ تقدیر

لِسانی مباحث میں 'تقدیر' کا لفظ ذرا بے محل سا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میں نے اس لفظ کو 'مُستقبل' پر اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ کے مقدرات کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے، جن سے اردو زبان آجکل دوچار ہے۔

اردو زبان تاریخ کے ایک سَیل کی رَو میں پیدا ہوئی، آج یہ سیاست کی زد میں آکر اپنے وجود پر پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ ایک طرف اس کے بارے میں خوش فہمیاں ہیں جن کے سبب ہم اس کی صورتِ حال کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر ہیں دوسری جانب اغیار میں اس کے سلسلے میں کچھ ایسی غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں اور اس کو اس قدر خطرناک مجرم قرار دے دیا گیا ہے کہ سیاسی اختلافات رکھنے والی پارٹیاں بھی اس مخالفت میں ایک رائے ہو جاتی ہیں۔

پہلے اپنی خوش فہمیوں سے بحث کر لی جائے۔

اُردو والے اب تک اسے ایک ہمہ گیر زبان سمجھتے ہیں اور ۱۹۴۷ء سے قبل کی زبان میں اسے ایک کُل ہند حقیقت تسلیم کرانے پر اصرار کرتے ہیں، جب کہ ہندوستان کا ایک ضلع بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس کو مادری زبان لکھوانے والے اکثریت میں ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے، جس کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد دو کروڑ ۸۶ لاکھ سے اوپر ہے۔ یہ گجراتی، ملیالم، کنڑ، اوڑیا، پنجابی، آسمیا اور کشمیری زبانیں بولنے والوں سے زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مردم شماری میں اس سے متعلق دھاندلی ہوتی آئی ہے اور اس کے بولنے والوں کے اندراجات میں صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ صرف ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو لے [illegible] دیکھیے کہ بعض ریاستوں میں کس طرح اس کے بولنے والوں کی تعداد اتنی بھی نہیں لکھی گئی جتنی کہ اس ریاست کی مُسلم آبادی کا اندراج ملتا ہے۔

	مسلم آبادی	اُردو آبادی	تفاوت
۱۔ اتر پردیش	ایک کروڑ چھتیس لاکھ ۷۶ ہزار	۹۲ لاکھ، ۳۷ ہزار	۴۳ لاکھ

۲ - بہار	۷۵ لاکھ ۹۴ ہزار	۴۹ لاکھ، ۹۳ ہزار	۲۶ لاکھ
۳ - مہاراشٹر	۴۲ لاکھ، ۳۳ ہزار	۳۶ لاکھ، ۶۱ ہزار	۶ لاکھ
۴ - آندھراپردیش	۳۵ لاکھ، ۲۰ ہزار	۳۲ لاکھ ۹۹ ہزار	۵ لاکھ

دونوں قسم کی آبادی کا فرق اترپردیش اور بہار میں جنوب کی ریاستوں مہاراشٹر، آندھراپردیش اور کرناٹک سے بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ظاہر کہ مذہب کے خانے میں اسلامی ناموں میں دھاندلی اس قدر آسانی سے نہیں کی جاسکتی جتنی کہ ہندی اُردو کو ایک زبان بتا کر۔ پھر اُردو کو مادری زبان تسلیم کرنے والے غیر مسلموں کی تعداد اب چند درچند، سہی تاہم کچھ تو ہے۔ اس جدول سے آپ کو اس بات کا بھی علم ہو جائے گا کہ اُردو سے دھاندلی کا دھندہ ہندی کی ریاستوں میں زیادہ کالا ہے۔ غیر ہندی ریاستوں میں مسلم آبادی اور اُردو کے اندراجات میں اس قدر فرق نہیں ملتا۔

اُردو کے سلسلے میں ایک اور تاریخی حقیقت کا اظہار بھی یہاں بے مصرف نہیں ہوگا۔ مشترکہ زبان کی حیثیت سے اُردو کا نقطۂ عروج ۱۹۰۰ء کے قریب ملتا ہے حالانکہ ہندی اُردو جھگڑے کا آغاز ہنگامہ غدر کے فوراً بعد سے ہوگیا تھا، جب سرسیّد جیسے محب وطن کو بنارس میں اس سلسلے پر ۱۸۶۷ء میں پہلا دھکا لگا تھا: یہ بات حالیؔ کی زبان میں سنیئے؛

"چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

"سرسیّد کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

لیکن وہ غیر مسلم جو اُردو کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے ان کی اس سے محبت کسی طرح کم نہیں ہوئی، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، پریم چند، سرتیج بہادر سپرو، پنڈت دتاتریہ کیفی ایسے بیسوں نام ہیں جن کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اُن کے دم سے اُردو کا خم باقی ہے۔

اسی زمانے میں بیشتر غیر مسلموں نے اپنے لسانی دائرے بدلنا شروع کر دیئے، انھیں جدید

ہندی کے ارتقا میں اپنی پراچین سبھیتا کا ایک نشان نظر آیا، اور یہ حقیقت بھی تھی، لہٰذا بیسویں صدی میں اُردو کے حلقے سے ہندی کے حلقے میں داخل ہونے کا یہ عمل تیز تر ہوگیا۔ کانگریس نے گاندھی جی کی قیادت میں 'ہندوستانی' دونوں لکھاوٹوں کا پروگرام تیار کیا۔ ۱۹۲۵ء کے کانپور کے کانگریس سیشن میں اس مقصد کے لئے ایک باقاعدہ ریزولیوشن بھی پاس کر دیا گیا، لیکن پرشوتم داس ٹنڈن اور ان کی ہندی ساہتیہ سمیلن نے اس نکتہ پر لوجیہ، گاندھی جی کی بات نہیں مانی اور انھیں سمیلن سے استعفیٰ دینا پڑا۔

اِدھر سر سیّد کے زمانے سے اُردو اپنے دفاع کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ یہ محسن الملک ہی تو تھے جو لفٹیننٹ گورنر میکڈانل کی ایک دھمکی میں اُردو کے محاذ سے یہ شعر فاتحہ پڑھتے ہوئے دستبردار ہوئے تھے:

ع   عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دراصل اہلِ اُردو کی یہ کوتاہ نظری رہی ہے کہ انھوں نے ابھرتی اور بڑھتی ہوئی ہندی کے مقام کو نہیں پہچانا اور اسی نسبت سے دبتی اور گھٹتی ہوئی اُردو کا مقام ایک لسانی اقلیت کے طور پر کرنے سے اغماز کرتے رہے۔ فلموں اور مشاعروں کے حوالوں سے وہ اُردو کی برتری قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور اپنے تعلیمی اداروں میں اسے ایک علمی زبان بنانے سے غفلت برتتے رہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ علی گڑھ نے سر سیّد سے لے کر تا حال اُردو کے حق کو ادا نہیں کیا ہے۔ اس کے سربراہوں نے اُردو کی لڑائی کالج کی چہار دیواری کے باہر تو لڑی اپنے صحن میں نہیں۔ یہی حال جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کا ہے جو ایک اُردو اساس ادارے کے طور پر وجود میں آئی اور رفتہ رفتہ اپنے اصل کردار کو کھوتی گئی۔

یہیں سے یہ تکلیف دہ سوال اٹھتا ہے کیا اُردو، اہلِ اُردو کے لیے ایک 'قدر' کا حکم رکھتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو خاص طور پر ہمارا تعلیم یافتہ اور متوسط طبقہ اپنے بچّوں کی تعلیم میں اس کی جانب سے اغماز کیوں کر رہا ہے؟ غیر مسلموں کے ذہنی روّیے کو تو سمجھا جا سکتا ہے۔ اُردو کے ایک غیر مسلم معروف پروفیسر نے ایک بار بڑی صفائی سے کہا تھا کہ اُردو میری پیشہ کی زبان ہے تہذیبی زبان نہیں، حالانکہ غیر مسلم حضرات میں معدودے چند ایسے حضرات بھی ہیں جن کے رگ و پے میں

اُردو اسی طرح سرایت کیے ہوئے ہے جس طرح کسی اُردو کو چاہنے والے مسلمان میں۔ میں آنند نرائن مُلّا کا وہ بیان کبھی نہیں بھول سکتا جو انھوں نے اُردو کانفرنس میں آزادی ملنے کے فوراً بعد دیا تھا:

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔"

کیا کوئی مسلمان اُردو کے عشق میں یہاں تک جا سکتا ہے؟ حالانکہ اُردو کا خلیقہ ETHOS بیشتر اسلامی ہے اور آزادی کے بعد مذہب کی طرح یہ اسلامی تشخص کی سب سے بڑی علامت بنتی جا رہی ہے۔ لیکن ہمارے قائدین ملت اس نکتے سے تاحال بے خبر ہیں، وہ فروعات کو اصل اسلام سمجھتے ہیں، اس کے لیے بڑی بڑی تحریکیں چلاتے ہیں لیکن اُردو زبان کے سلسلے میں نہ کوئی جلوس نکالتے ہیں اور نہ دھرنا دینے کے قائل ہیں۔

اُردو کی لڑائی ہمیں دو محاذوں پر لڑنی ہوگی۔ سیاست کے میدان میں اور اپنے گھر کے آنگن میں۔ میں گھر کے آنگن کی لڑائی کو بنیادی سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ کسی بھی تہذیب کی اساس میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عربی کے بغیر اسلام کا، سنسکرت کے بغیر ہندو دھرم کا عبرانی کے بعد اسرائیلیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر قومیتوں کی بنیادیں زبان پر قائم ہیں۔ زبان کھو کر کوئی جماعت اپنے خلقیہ (ETHOS) کو قائم نہیں رکھ سکتی۔

اگر اُردو والوں کا اعتقاد ایک بار اپنی زبان پر راسخ ہو جائے اور وہ اُسے اپنے تشخص کے لیے ایک لازمی عنصر گردانے لگیں تو اس کے تحفظ و بقا کے کئی پروگراموں پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

۱۔ اُردو کے آئینی حق کو تسلیم کرانے کے لیے ریاست بہار کے انداز پر اُتر پردیش اور دیگر ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں اُس ریاست کی زبان کے ایکٹ میں ترمیم کرا کے اُردو کا ثانوی حیثیت سے اس میں شمول کرانا۔ اس راہ میں سنگ گراں حائل ہیں البتہ اس کے لیے ہمیں ہر سیاسی جماعت کے روشن خیال طبقے کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ بائیں بازو کی جماعتیں جو خود کو اس کا دعویدار کہتی ہیں، اس کے لیے زیادہ جواب دہ ٹھہرائی جائیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ چند برس پہلے PI ۶ حاوی ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے لکھنؤ میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تجویز کی پرزور مخالفت کی۔ اس مکتب فکر کے ایک سرگرم رکن پروفیسر نامور سنگھ،

ساری ترقی پسندی اور روشن خیالی کو بالائے طاق رکھ کر آج کل اُردو کے خلاف خوب زہر اگل رہے۔ کانگریس کا رویہ اُردو کے سلسلے میں آزادی ملنے کے بعد سے اب تک لطائف الحیل کا رہا ہے۔ الیکشن کے قریب غزل کے سے وعدہ و وعید شروع ہو جاتے ہیں۔ الیکشن مینی فیسٹو میں اُردو کے حقوق کا شدومد کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے لیکن بعد کو ایک واسدیو اترپردیش کی وزارت کے فیصلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کو کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا اُردو کے حقوق کے سلسلے میں سیاسی دباؤ ہی نہیں، مناسب وقت پر سیاسی سودے بازی سے بھی اجتناب نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) اُردو کے تعلیمی نظام کی ازسرِ نو تشکیل کی ضرورت۔ اترپردیش میں مسلم یونیورسٹی کے تین اسکولوں کو چھوڑ کر ایک بھی اُردو میڈیم کا ہائی اسکول باقی نہیں رہا۔ متوسط طبقے کے بچے یا تو انگریزی میڈیم کے اسکولوں کا رُخ کرتے ہیں یا جن کے والدین ان کے اخراجات کے کفیل نہیں ہو سکتے وہ سرکاری ہندی میڈیم کے اسکولوں میں داخلہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ریاست بہار، آندھرا پردیش، اور مہاراشٹر میں بڑی تعداد میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول کامیابی کے ساتھ سرکاری امداد سے چل رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے مکتبوں میں، دینی تعلیم کے رہنماؤں کی بدولت اُردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جا رہی ہے لیکن ان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کا تعلق بالعموم نچلے اور نادار طبقے سے ہے۔ یہ بچے جب ثانوی اسکول کے درجوں میں آکر اپنا ذریعۂ تعلیم بدلتے ہیں تو درجے میں پھسڈی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اُردو ذریعۂ تعلیم کی ازسرِ نو تشکیل کی سخت ضرورت ہے۔

اِس سلسلے میں ایسے ادارے جن کے آگے 'مسلم' یا 'اسلامیہ' کے الفاظ لگے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُردو ذریعۂ تعلیم کی تشکیل کا آغاز اپنے یہاں سے کریں۔

(۳) دراصل ہم جب بھی ذریعۂ تعلیم کے بارے میں سوچتے ہیں تو روزی روٹی کمانے کے لیے سرکاری ملازمتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات اعداد و شمار سے ثابت کی جا سکتی ہے سرکاری ملازمتیں بیس فی صدی سے بھی کم روزی روٹی کا بندوبست کرتی ہیں۔ اردو والوں کے سلسلے میں تو ۳،۴ فی صد سے بھی کم، لہٰذا کمائی کا وسیلہ درحقیقت دیگر پیشے ہیں جن کے لیے مادری زبان کے ذریعہ دی ہوئی تعلیم سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ البتہ اس تعلیم کو جدید انداز کی

ہونا چاہیے۔ دینی کے ساتھ دنیوی بھی۔

(۴) اُردو ذریعہ تعلیم کے نظام میں ہمیں دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست کرنا ہوگا۔ انگریزی کا وہ مقام قائم نہیں رہ سکتا جواب تک رہا ہے۔ ہندی زندگی کے ہر شعبے میں رابطے کی زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اُردو والوں کے لیے دونوں کا اپنا اپنا مقام ہوگا جو ان کی عملی ضرورت کے پیش نظر متعین کرنا ہوگا۔ غیر ہندی کے علاقے کے اردو والوں کو وہاں کی علاقائی زبان (تمل، تلگو، مراٹھی وغیرہ) بھی سیکھنا ہوگی۔ اِسی نسبت سے ان کو ہندی جاننے کی ضرورت کم ہوگی۔

(۵) میرے لیے اس کا تصوّر بھی ناممکن ہے کہ روزی روٹی کے نام پر یا سرکاری ملازمتوں کی لالچ میں کوئی گروہ اپنی نئی نسل کو اپنے لسانی ورثے اور ترکے سے محروم کردے۔ میں اسے اخلاقی دیوالیہ پن کہوں گا۔ ہر جماعت کی زبان اس کے تشخص اور شناخت کا مرکزی نقطہ ہوتی ہے یہ بعض اوقات عقائد سے بھی زیادہ مؤثر اور قوی ترین جاتی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بنگلہ دیش کی مثال ہے۔ میں خالصتان کی تحریک میں بھی پنجابی زبان اور گورومکھی رسم خط کے تحفظ کو بنیادی نکتہ سمجھتا ہوں۔ جب کوئی تامل سربراہ یہ کہہ کر اُٹھتا ہے کہ میں پہلے تامل ہوں اور بعد کو ہندوستانی یا دستورِ ہند کی جلدوں کو نذرِ آتش کرتا ہے تو اس کے پیچھے بھی مذہبی نہیں لسانی تحفّظ کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

یہ اُردو والوں کی بدقسمتی ہے کہ اپنی زبان کے بارے میں وہ اس شدّت سے محسوس نہیں کرتے۔ ہندی ریاستوں میں اُن کے تعلیمی نظام کو برباد کردیا گیا ہے، اُردو بولنے والے بچّوں کی ابتدائی تعلیم تک دینے کی سہولتیں ان کی مادری زبان میں فراہم نہیں کی جاتیں جو دستورِ ہند کی ہدایات اور دفعات کے عین منافی ہے۔ اگر ہم لب کُشا ہوتے ہیں تو ہماری حب الوطنی اور وفاداری کو مُشتبہ قرار دیا جاتا ہے۔ الیکشن کے موسم میں وعدے کئے جاتے ہیں وہ ایفا نہیں کیے جاتے ہیں، ہماری توجہ کو بنیادی مسائل سے ہٹا کر اکادمیوں کے مناصب اور انعامات کی ترجیحات میں اُلجھا دیا جاتا ہے۔ خود اُردو بولنے والوں کو اس بات کا احساس نہیں رہا کہ ہم کیا کھو کر کیا پارہے ہیں؟ ہم اُردو زبان کو کھو کر کیا رہ جائیں گے؟ لسانیات کے ایک

طالب علم کی حیثیت سے میں اس کے تصوّر سے بھی کانپ اُٹھتا ہوں، لیکن شکست خوردگی کا احساس تو ہمارے اندر آزادی کی صبح پیدا ہو گیا تھا۔ یقین نہ آئے تو گاندھی جی کی چیلی ریحانہ طیّب جی کے اس خط کے اقتباسات سنیے جو انھوں نے پوجیہ 'باپو جی' کو لکھا تھا: لکھتی ہیں:

"جب تک ہندوستان سالم تھا، اسے سالم رکھنے کی اُمید تھی تب تک ناگری لکھاوٹ کے ساتھ اُردو لکھاوٹ کو چلانا میں مناسب بلکہ ضروری جانتی تھی۔ آج ہندوستان پاکستان دو الگ ملک بن گئے ہیں.... پھر ناگری کے ساتھ اُردو کو بھی قومی لکھاوٹ کی کیا ضرورت؟..... اگر آپ نے ناگری کے ساتھ اُردو کو بھی قومی لکھاوٹ بنالیا تو آپ ہندوستان کے اندر ایک دوسرا پاکستان کھڑا کر دیں گے.... اب ایک مسلم ہندوستانی کی حیثیت سے میری التجا ہے کہ خدا کے لیے مسلمان ہندوستانیوں کو اپنے ہی ملک میں پردیسیوں کی طرح رہنے کے لیے بڑھاوا نہ دیجیے۔"

ہندوستان میں اُردو سے متعلق یہ ذہنیت آج بھی کام کر رہی ہے۔ اکثریت کا خیال ہے کہ اُردو کو بڑھاوا دینے سے ہندوستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اقلیّت اپنی انفرادیت کی تلاش میں ہے لیکن اس کے سربراہ جن کا تعلق متوسط طبقے سے ہے، خوف یا مصلحت کی بنا پر کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں، ایسا معلوم ہوتا ہے، مذہب کو زبان سے علیحدہ کر لیا ہے۔ ایک میدان میں ہم خوب بھڑکنا جانتے ہیں اور دوسری جگہ بھڑکنے کے مذبوحی عمل کے سوا ہم سے کچھ سرزد نہیں ہوتا۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے تہذیبی ورثے کی حقیقتِ بسیط کا ایک کلّی تصوّر رکھتے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ کسی ایک کی قیمت پر دوسرے کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اقبالؔ سے اعتذار کے ساتھ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اُردو زباں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

پروفیسر مسعود حسین خاں

اُردو لغت نویسی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری

میں نے اپنے ایک مقالے " اُردو لغت نویسی کے بعض مسائل میں جو چند سال قبل سید عابد حسین خطبات کے سلسلے میں پڑھا تھا، لکھا تھا:

" لغت نویسی ایک شوقِ فضول اور پیشۂ جاں کاہ ہے۔ انگلستان کے ایک نوجوان ماہرِ لسانیات سے حالیہ ملاقات کے موقع پر جب اس نے مجھ سے میرا موجودہ شغل دریافت کیا تو میں نے جواباً کہا: " آج کل میں لغت کے مرض میں گرفتار ہوں [۱]۔ خدا آپ کو شفا دے۔ اس نے انگریزی کے مخصوص مزاجِ خشک کے انداز میں کہا، اور پھر یک لخت چہرے پر سنجیدگی کے آثار طاری کرتے ہوئے ترحم کے لہجے میں یوں لب کشا ہوا۔ لغت نویس بے چارے کو جیتے جی صلہ بھی مل جائے، ستائش نہیں ملتی۔ ہاں اس جہانِ گزراں سے گزر جانے کے بعد اس کی نشست بقائے دوام کے دربار میں محفوظ ہو جاتی ہے۔"

جب مجھے اپنے عزیز اور صاحبِ "نشان" دوست ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ترقی اُردو بورڈ (کراچی) کے اُردو لغت کے مدیرِ اعلیٰ مقرر کیے جانے کی خبر ۱۹۸۵ء میں ملی تو میرے جذبات بھی کچھ اسی قسم کے ملے جلے حیرت اور ترحم کے تھے۔ میرے علم میں تھا کہ اس اُردو لغت (کلاں) کا منصوبہ

---

[۱] میں اس وقت ترقی اردو بیورو (ہند) کی اردو لغت کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت میں کام کر رہا تھا۔

ایک قومی ضرورت کی بنا پر حکومتِ پاکستان کی ایک قرارداد کے تحت ۱۹۵۸ء میں بنایا گیا اور اس کے پہلے مدیرِ اعلیٰ اُردو لغت نگاری کے جید عالم ڈاکٹر مولوی عبدالحق تھے، جنھیں اس سے قبل لغت نگاری کا وسیع اور گوناگوں تجربہ حاصل تھا۔ اس لغت کے لیے نمونے کے طور پر انگریزی کی آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کو سامنے رکھا گیا جو تاریخی اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ اس کی اہمیت کے بارے میں اس کے پہلے صدر محمد ہادی حسین کا یہ فخریہ لہجہ بے جا نہ تھا:

"یہ بات پاکستانی قوم کے لیے یقیناً باعثِ فخر و مباہات سمجھی جائے گی کہ انگریزی کے علاوہ دنیا کی کسی دوسری زبان میں اب تک اس قبیل اور اس پائے کی لغت شائع نہیں ہوئی۔ اگر ہم اسے اپنا ایک قومی شاہ کار کہیں تو کیا یہ ایک مبالغہ آمیز دعویٰ ہوگا؟"

"پاکستانی قوم" ہی نہیں، میرے خیال میں اس پر ساری دنیا کی اُردو برادری ناز کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے اُردو لغت کی ایک سال کے عرصے سے زیادہ خدمت نہ کر سکے۔ اس لیے اس کی ابتدائی چھ جلدوں کو مرتب کرنے کے تمام تر ذمہ داری اس کے دوسرے مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو ادا کرنی پڑی جنھوں نے اس حیثیت میں ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۴ء تک کام کیا۔

ڈاکٹر ابواللیث کئی لحاظ سے ایک دیدہ ور لغت ساز تھے۔ وہ بدایوں کے اہلِ زبان تھے اور اُردو کے کلاسیکی سرمائے پر ان کی بہت اچھی نظر تھی۔ انھوں نے اُردو لغت کو صحیح راستے پر ڈالنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ ان کے اردگرد صاحبانِ علم و نظر کا بڑا اچھا حلقہ تھا۔ انھوں نے خاص طور پر اشتقاقات کے صبر آزما طلب کام کو ڈاکٹر شہید اللہ، ڈاکٹر ستر واری اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بعد سنبھال لیا۔ اس لغت کا یہی حصہ سب کے مخدوش تھا، اس لیے کہ اس کے لیے نہ صرف اعلیٰ ہندی بلکہ سنسکرت دانی کی ضرورت تھی۔ ان علوم کے ماہرین کا پاکستان میں فقدان تھا۔ ایک اور دقت طلب حصہ قدیم اُردو (دکنیات) سے تعلق رکھتا تھا جس کے تلفظات کا تعین ہمیشہ ایک مشکل کام رہا ہے۔ اس میدان میں اچھے اچھے دکنی شہسواروں کے بھی قدم لڑکھڑا گئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری منصۂ لغت پر مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب اس اس عظیم لغت کی چھ جلدیں مرتب ہو کر شائع ہو چکی تھیں۔ اس سے قبل وہ اُردو کے ادیب اور استاد کی حیثیت سے اپنا مقام بنا چکے تھے، لیکن لغت نویسی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ زبان اور علم زبان کے بارے میں ان کی وہ واقفیت نہیں تھی جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو حاصل تھی۔ بڑی جسارت کی بات تھی کہ انھوں نے اس میدان میں بھی قدم رکھ دیا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ اس میں بھی، اپنی غیر معمولی محنت اور انہماک کی بدولت کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اب تک ان کی ادارت میں آٹھ جلدیں (ساتویں تا چودھویں) مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور پندرھویں جلد زیر طباعت ہے۔ چودھویں جلد کے مختصر دیباچے میں انھوں نے یہ خوشخبری دی ہے: "لغت کے تین چوتھائی حصے کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب صرف پانچ حروف (م، ن، و، ہ، ی) کی تسوید و تدوین کا کا کام باقی رہ گیا ہے جو انشاء اللہ آئندہ تین سال کے اندر حتمی طور پر مکمل ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ۱۹۹۵ء کے اختتام تک لغت کی تمام جلدیں جو سترہ پر مشتمل ہوں گی شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں آجائیں گی۔ یہ یاد رہے کہ اصل منصوبے کی تشکیل کے وقت خیال تھا کہ مکمل لغت کے لیے ایک ہزار صفحات پر مشتمل تیرہ جلدیں درکار ہوں گی۔

ڈاکٹر فرمان نے جلد ہفتم کے دیباچے میں بجا طور پر لکھا ہے:

> (جلد ہفتم) ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے ابتدائی چھ جلدوں سے قدرے مختلف ہے..... ظاہری تبدیلی یہ ہے کہ اس کے صفحات کا انداز خاصا بدلا ہوا ہے۔ بین السطور فاصلہ کم سے کم ہے اور غیر ضروری طور پر کہیں کوئی جگہ خالی نظر نہیں آتی۔ پھر بھی حروف و طباعت پہلے کی بہ نسبت زیادہ نمایاں اور روشن ہیں خاص بات یہ ہے کہ زیر نظر جلد کے دو صفحوں میں پچھلی جلدوں کے تین صفحوں کا مواد سما گیا ہے۔

اُردو لغت کی ابتدائی جلدوں کو دیکھ کر میرا بھی کچھ اسی قسم کا ردعمل تھا کہ کمپوزنگ کے اعتبار سے اس لغت میں کاغذ کا ضیاع بہت زیادہ ہوا ہے!

اُردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں آٹھویں جلد تک پہنچتے پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر فرمان نے بہت

جلد یہ اندازہ لگالیا کہ زیر تدوین اُردو لغت کا کام، آکسفورڈ ڈکشنری سے بھی زیادہ دشوار ہے، وجہ یہ ہے کہ اُردو کے حروف تہجی اور اصوات کی تعداد انگریزی سے تقریباً دوگنی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی نوعیت یہ ہے کہ علاقائی اور بعض دوسری زبانوں کے علاوہ اس میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور سنسکرت کے ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ کہیں یہ الفاظ اپنی اصلی حالت میں ہیں اور کہیں بدلی ہوئی صورت میں۔ یہی کیفیت ان کے تلفظ اور معنی کی ہے۔ ایسی حالت میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو لغت کے سلسلے میں کسی لفظ کے مادے کی تلاش اور اس کی اشتقاق نگاری کا کام کتنا مشکل ہے۔ کمپوزنگ اور طباعت کی مشکلات بھی انگریزی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔

اُردو لغت کی آٹھویں جلد تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر فرمان نے مکمل انتظامی اعتماد کے ساتھ لغت کے مسودے کی کمپوزنگ کا کام کمپیوٹر کے ذریعے شروع کرا دیا۔ اس طرح کہ "کمپیوٹر کمپوزنگ کے ذریعے نسخ میں شائع ہونے والی کتابوں میں اُردو لغت کی آٹھویں جلد، پاکستان میں پہلی کتاب ہے جو سارے ضروری اعراب ونشانات کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔۔۔۔ یہ اس سے پہلے کی طباعتوں سے روشن تر ہے۔ ڈاکٹر فرمان کی تحریر میں اب اعتماد کی لے بڑھتی جارہی ہے نویں جلد صحت متن، معیار، اسناد، کمپوزنگ، طباعت، کاغذ اور جلد سازی کے اعتبار سے اور بہتر ہوگئی ہے۔

چودھویں جلد کی طباعت تک پہنچتے تک ڈاکٹر فرمان نے طباعت کی جملہ تیکنیک پر قابو پاکر سارا کام بورڈ کے احاطے میں مکمل کرنا شروع کر دیا۔

جن حضرات کو لغت نویسی اور لغت سازی کا تجربہ ہے، خوب جانتے ہیں کہ لغت کا مسودہ تیار ہو جانے کے بعد جدید ترین طباعت سے آراستہ کرنے میں کیا مراحل پیش آتے ہیں۔ ان کا تذکرہ لغت کی نویں تا چودھویں جلد کے دیباچوں میں ملتا ہے۔

آیئے اب دیکھیں اندرون خانہ کیا حال ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں لغت سازی، لغت بازی نہیں ہوتی۔ یہ ایک نہایت محنت طلب اور سنجیدہ کام ہے۔ اس کے لیے ایک تربیت یافتہ ذہن اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے ایک ایسی علمی جماعت کی جو قلم کی سیاہی ہو

ہو اور گرم بھی، جو خود کام کرتا ہو اور دوسروں سے کام لینا جانتا ہو، اور جس کی لغت سازی کی تفصیلات وجزئیات پر گہری نظر ہو۔

ابتدا میں جب لغت مذکورہ کی چار پانچ جلدیں شائع ہو کر سامنے آئیں تو کئی سمتوں سے اعتراضات کی بارش ہوئی۔ کچھ اعتراضات برائے اعتراضات تھے۔ کچھ خوردہ بینی کے تحت آتے ہیں۔ کچھ صحیح تھے، کچھ غلط منصوبے کی جامعیت اور ناساعد حالات پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے تنقید، تنقیص بن گئی۔ تاہم لغت سازی کے جو بنیادی اصول مرتب کیے گئے وہ صحیح تھے مثلاً

۱ ۔ پہلی جلد کا آغاز الف مقصورہ سے کیا ہے، جب کہ تمام دوسری لغات متداولہ فارسی کی ہوں یا اُردو کی، الف ممدودہ سے شروع ہوتی ہیں۔ ایسا کرتے وقت اس صوتیاتی حقیقت کو پیش نظر رکھا گیا کہ چھوٹے مصوتے کے طور پر، الف مقصورہ، الف ممدودہ سے پہلے آتا ہے۔

۲ ۔ قدیم روایت کے خلاف بھ، پھ، تھ، ٹھ وغیرہ کو جدید صوتیات کی روشنی میں ایک الگ اور مستقل (نہ کہ مخلوط) آواز تسلیم کرتے ہوئے ان سے مرکب الفاظ کی تقطیع علاحدہ سے قائم کی گئی۔ مولوی عبدالحق اپنی لغت کبیر میں اس کا آغاز کر چکے تھے۔ حروف تہجی کے اس نظام سے ساری لغت میں الفاظ کو از سر نو ترتیب دینا پڑی ۔

۳ ۔ املا کے بارے میں بھی صحیح رویہ اختیار کیا گیا، یعنی کثیر الاستعمال کو ترجیح دیتے ہوئے لفظ کی دوسری شکلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

۴ ۔ تاریخی اعتبار سے کل اُردو ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا دور (جسے دکنی اُردو کا دور کہا جاتا ہے) ولی اورنگ آبادی پر ختم ہو جاتا ہے دوسرا دور غالب پر اور تیسرا دور غالب کے بعد سے اب تک جاری ہے۔ بعض لحاظ سے یہ تقسیم من مانی ہے لیکن اُردو زبان کی مختصر عمر کے پیش نظر اس کے سوا اور کوئی ترتیب نہیں قائم کی جا سکتی ۔

ڈاکٹر فرمان نے ان اصول وضوابط کا نہایت احتیاط سے خیال رکھا ہے ابتدائی مرحلوں میں جلدوں میں اشتقاقات کی جانب سے جو سہل انگاری برتی گئی ہے اور پراکرت، ہندی اور سنسکرت اشتقاق کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے اور اکثر جگہ صرف پراکرت کی شکل پلیٹس سے لے کر دیدی ہے ۔ اس کے لئے انہیں براہ راست سنسکرت کی لغات سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔

الفاظ کے معنوں کے تعین میں بھی انھوں نے بعض اوقات اس سہل پسندی کو روا رکھا ہے جو لغت کی ابتدائی جلدوں میں ملتی ہے: یعنی الفاظ کے معنی" جامع اللغات " جیسی غیر مستند لغت یا پلیٹس جیسی ہندی اُردو دونوں لغات کو محیط لغت سے دے کر چھٹکارا پالیا گیا ہے۔

جامع اللغات کے بارے میں مدیر اعلیٰ موصوف کو لغت کے پہلے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے جان لینا ضروری تھا۔ اور پلیٹس کی گراں بار لغت سے معنی اخذ کرتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری تھا کہ یہ لغت بہت سے ایسے الفاظ کا احاطہ کرتی ہے جو ہندی سے مختص ہیں اور جنھیں اُردو کے مستند ادیبوں نے اپنی تحریروں میں کبھی بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ اس طرح بہت سے الفاظ بغیر اُردو کے حوالوں کے داخل لغت ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس طرح کا ایک لفظ، دِگی، دِگھی ہے جس کے معنی بلبوترے تالاب کے دیے ہیں اور حوالے کے سلسلے میں جامع اللغات اور پلیٹس کی لغت کے نام لیے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی مثالیں بڑھائی جاتی ہیں جو ہندی یا فارسی یا غیر مستند اُردو لغات سے اخذ کی گئی ہیں اور جن کی کوئی مثال اُردو ادب سے دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ تاریخی اصول پر لغت کے لئے ضروری نہیں کہ زبان کا ہر لفظ شامل کر لیا جائے۔ اس طرح تو یہ بولیوں کے ایک ملغوبے کی لغت ہو جائے گی۔

کسی لفظ کے پہلی بار استعمال کے سنہ کا تعین بھی ایک نازک معاملہ ہے۔ اُردو میں انگریزی کی طرح اوّل تو بہت سے مخطوطات کا سنہ تصنیف معلوم نہیں۔ بلکہ بعض اوقات خود مصنف کے بارے میں تعین سے نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی صورت میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مشتبہ اُردو تصانیف سے اسناد اخذ کرنا کہاں تک بجا ہوگا، یا مثنوی پدم راؤ کدم راؤ کا سال تصنیف ۱۴۳۵ء متعین کرنا کہاں تک صحیح ہے جب کہ ۱۴۲۵ء سے ۱۴۴۲ء تک ہو سکتا ہے میرا خیال ہے لغت کے کسی اگلے ایڈیشن میں اُردو الفاظ کے ماخذات کی صحت پر نظر رکھنی ہو گی۔ اس طرح اشتقاقات کے ساتھ اندراجات دونوں کو زیادہ سائنٹیفک بنانا ہوگا۔

اُردو لغت کے بارے میں ان چند اصلاحی اشارات کا یہ مطلب نہیں کہ اس عظیم اُردو لغت پر جو کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ کم حیثیت ہے۔ اُردو کے قدیم ادب کے مخطوطات کے غیر مرتب یا غلط مرتب ہونے کی شکل میں اردو کے قدیم ادب کے مخطوطات کے غیر مرتب یا

غلط مرتب ہونے کی شکل میں اُردو کا لغت نگار اس سے زیادہ اہل علم کو کیا دے سکتا ہے لغت نگاری ایک صبر آزما کام ہے، جان لیوا بھی۔ کہا جاتا ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کے کئی مدیروں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر کے یہ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ لغت نگاری کے لیے بہت بڑے وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو لغت کو یہ وسائل کبھی بھی میسر نہیں رہے۔ لغت نویسی ایک پنچایتی کام ہے۔ اس پنچایت کا ہر فرد اپنی جگہ پر مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے کسی بھی مرحلے میں ذرا سی چوک مشین کی پوری کارگزاری پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسی لغت میں لفظ "فکیر کو فکر کا قدیم املا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ املا کا نہیں تلفظ کا ہے۔ قدیم اُردو میں اکثر الفاظ یائے زائدہ کے ساتھ ملتے ہیں جیسے کیدھر، جیدھر اور پھر فکیر کا تو قافیہ "فقیر" موجود ہے۔

خدا نے دیے عالماں اور فقیر
انھو کو بھی دُنیا کی آتی فکیر (مینا ستونتی)

اردو لغت ایک ایسا منصوبہ ہے جو اُردو زبان میں نہ کبھی تجویز ہوا اور نہ تکمیل کو پہونچا۔ (یہ ابھی رو بہ تکمیل ہے) یہ کم شرف نہیں ان حضرات کے لیے جنھوں نے اسے تجویز کیا اور جنھوں نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس کے ہر ہر صفحے سے اس کے مدیروں کی محنت، ہمت، نظر اور خلوص کا علم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے اس علمی مہم کا سب سے زیادہ حصہ سر انجام دیا ہے۔ انھوں نے پہلی بار اس کے ڈول اور ڈھانچے (FORMAT) پر توجہ دی۔ ان کے زیر نگرانی مرتب کردہ جلدوں میں وہ خامیاں بھی کم تر نظر آتی ہیں جنھیں لے کر "یاران اردو" لے اڑے تھے۔ زبان دانی اور لغت نویسی میں علمی اختلافات کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے کسی علمی کام کی مجموعی حیثیت کو دیکھنا ضروری ہے۔ "اُردو لغت" ایک بڑا علمی کام سر انجام ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ اسے بڑی چوکسی اور جا بکدستی سے انجام دے رہے۔ ہاں، اس کے اگلے ایڈیشن سے پہلے اس پر نظر ثانی کی یقیناً ضرورت ہوگی، اس لیے ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

انتخاب کلام

نوٹ :- ذیل کے انتخاب میں جو غزل اور نظمیں پیش کی جا رہی ہیں وہ پروفیسر مسعود حسین خاں کے مجموعۂ کلام "دونیم" میں شامل نہیں ہیں۔

(مرتّب)

ایک کہانی

رات، کل فضاؤں میں تیری کہانی تھی
آسماں سے آمد تھی، گم شدہ خیالوں کی
دُور ساری دنیا سے، اک نگر بسایا تھا
زُلف و رُخ کی باتیں تھیں، کیا دن کیسی راتیں تھیں
یاد ہیں وہ دن اب تک جب حسین راتوں میں
تیرے اک تبسم پر وقت بھی ٹھہر جاتا!
آنسوؤں سے جیتا تھا، گوھر محبت کو
کتنی گرم جوشی تھی، کتنی گریہ و زاری
یہ مری خدائی تھی یا تری، خدا جانے

ہم ہی سننے والے تھے، دل کی پاسبانی تھی
جس قدر تصور تھا، اتنی شادمانی تھی
اُس کا ایک راجہ تھا، اس کی ایک رانی تھی
صبح کتنی رنگیں تھی، شام کیا سہانی تھی
تیری گنگناہٹ پر، میری نغمہ خوانی تھی
اُس میں کب ترنم تھا، اس میں کب روانی تھی
تیری کامرانی بھی کیسی کامرانی تھی
کتنی سرد مہری تھی کتنی سرگرانی تھی
میری لن ترانی پر تیری بے زبانی تھی!

میں نے تجھ کو کب سمجھا، میں نے تجھ کو کب پایا
میں زمین کا بندہ، تو روح آسمانی تھی

مسلکِ تحقیق

(معین احسن جذبی کی "مسلکِ تخلیق" کے جواب میں)

اے بے خبر ز مقاماتِ و مسلکِ تحقیق
دیا نہیں ہے علی گڑھ میں کچھ بجز تخلیق

یہ خالقِ آمم شعر و کمم خبر مخلوق
یہی ہے تیرا مگر کاروانِ تعلیق

یہ میرا حرف اگر تیرے دل میں لائے ملال
تو یوں سمجھ کہ اسی رہ گزر کا ہوں میں رفیق

کہ میں بھی اُس بتِ پندار خو کا گاہک ہوں
سکھائے جس نے تجھے سب سخن وری کے طریق

سنوارا ہے انھیں زلفوں کو بارہا میں نے
کہ راز دار رہا جن کا تیرا دستِ شفیق

جس کا بوسہ کیا وقف جس نے میرے لیے
مرے نصیب میں لیکن کہاں تھے لعل و عقیق

وہ جس نے ابرو کو شانے پہ تیرے رکھ کے کہا
کہ تو بھی ایک ہے کافر اگر میں ہوں زندیق

وہ تیرے دام ہنر میں کچھ اس طرح سے رہی
میں اُس سے ملتا رہا بس بطورِ مردِ خلیق

تو اُس سے کہتا رہا اہلِ جستجو سے نہ مل
کہ درد و داغ کی دنیا میں یہ ہیں بد توفیق

جہاں ہو عشوہ مسلّم وہاں کہاں تعلیم
جہاں وفا ہو مقرر وہاں کہاں تصدیق

مگر وہ کافرہ کل رات مجھ سے کہتی تھی
(سمجھ سکے تو اگر اس کے نکتہ ہائے دقیق)

بہت دنوں میں کھُلا مجھ پہ ربطِ دانش و فن
بہت دنوں میں سمجھ پائی میں غلط تفریق

امینِ فن ہے وہی، جو ہے ضامنِ دانش
"ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق"
(حافظ)

(امریکہ مارچ ۱۹۵۸ء)

پیرِ مغان اُردو

(بر وفات نصیر الدین ہاشمی مرحوم)

سُونا سُونا سا ہے کیوں آج جہانِ اُردو
اُٹھ گیا کہتے ہیں اک پیرِ مغان اُردو

جس کو ڈھونڈیں گے سدا تشنہ لبانِ تحقیق
روئیں گے برسوں جسے دیدہ وران اُردو

راہ رو، رہگزر و رہبر اُردوئے قدیم
ورنہ ملتا تھا کسے نام و نشانِ اُردو

چھن گئی اہلِ وطن ایک متاعِ تحقیق
اے دکن اُلٹ گئی پھر تیری دکانِ اُردو

آخری تیر بھی ترکش کا ہوا راہ سپار
ٹوٹ کر رہ گئی لو آج کمانِ اُردو

"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن" علم
کس کے سر جائے گا اب بارِ گرانِ اُردو

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
اب فقط رہ گئے ہم پیشہ وران اُردو

غزل

یہ وہ دولت ہے کہ جس میں نہیں شرکت ممکن
ورنہ کب ہم کو شکایت کسی غم خوار سے تھی

جامِ غم، دردِ الم، شورشِ پیہم اور ہم
زندگی اپنی عبارت انھیں دو چار سے تھی

تجھ کو چاہا تو یہ مطلب تھا کہ پائیں گے کہاں
اک فقط ضد کہ ہمیں کوشش بیکار سے تھی

ہم بھی گھوم آئے ہیں وہ مملکت نوا فرنگ
قیمتِ حسن جہاں گرمیٔ بازار سے تھی

تجھ سے کب، کون خفا تھا دل و جانِ مسعود
دے اجازت کہ شکایت لب و رخسار سے تھی

غیر مطبوعہ

(امریکہ ۱۹۵۸ء)

URDUADAB

QUARTERLY

EDITOR

Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI